مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۷ | ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ | دسمبر ۲۰۱۶ء | شمارہ ۱۲

التعرف بالتصرف

تصرف کی پہچان

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/ ۲۰ روپے | زرسالانہ =/ ۲۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) مشرّف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ) لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ)

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

التعرف بالتصرف
تصرف کی پہچان

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار

۱۰	تمہید	۱......
۱۱	اقرارِ تصرف	۲......
۱۳	پریشانی کی اصل	۳......
۱۵	حقیقت رجاء	۴......
۱۷	اشراف نفس کی حقیقت	۵......
۱۸	طولِ امل	۶......
۱۹	اشکال و جواب	۷......
۲۰	طولِ امل کا اثر	۸......
۲۲	لطافت شریعت	۹......
۲۳	دیہاتیوں کا مزاج	۱۰......
۲۴	غرباء کا اکرام	۱۱......
۲۴	تجویز و تفویض	۱۲......

۱۳..... تفویض بغرضِ راحت ۲۶

۱۴..... کمال عبدیت ۲۷

۱۵..... تکمیل تام ۲۸

۱۶..... ضرورتِ مراقبہ تکمیل ۲۹

۱۷..... مراقبہ تقدیر ۳۰

۱۸..... دوامِ تفویض ۳۲

۱۹..... سوال وجواب ۳۳

۲۰..... قلب کی نگہداشت ۳۴

۲۱..... فائدہ ۳۵

۲۲..... مرزا قادیانی کے استدلال کے مسکت جوابات ۳۶

۲۳..... مسائل تصوف کا ثبوت ۳۷

۲۴..... لطیفۂ قلب ۳۸

۲۵..... غلبۂ تفویض ۳۹

۲۶..... تمکین اثر ۴۱

۲۷..... اشکال وجواب ۴۲

۲۸.....	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں سب سے بہادر تھے	۴۳
۲۹.....	توسط واعتدال	۴۴
۳۰.....	صاحبِ تمکین	۴٦
۳۱.....	مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مقامِ بلند	۴٦
۳۲.....	خلق وامر کی تفسیر	۴۹
۳۳.....	امر کی غلط تفسیر	۵۲
۳۴.....	روح کے متعلق بحث	۵۲
۳۵.....	آیت کی تفسیر	۵۴
۳٦.....	علمی اشکال	۵۵
۳۷.....	تصرف وحکمت	۵۸
۳۸.....	دعا وتفویض	٦۰
۳۹.....	مقصود دعا وتفویض	٦۲
۴۰.....	خلاف تفویض دُعا	٦۴
۴۱.....	تصرف بلاواسطہ	٦۵
۴۲.....	امن عامہ	٦٦

۴۳..... منشاء تفویض ۶۷

۴۴..... شرط احسان ۶۷

۴۵..... حاصلِ مضمون ۶۹

وعظ

التعرف بالتصرف

تصرف کی پہچان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے التعرف بالتصرف سے موسوم وعظ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ بروز منگل کو حضرت حکیم الامت کی اہلیہ صغریٰ صاحبہ کے مکان پر تین گھنٹہ تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مرحوم نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد مستورات کے علاوہ تقریباً چالیس تھی۔

مضمون تھا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ کے تصرف واختیار کا استحضار رکھنا چاہئے اور تصرف حق کے ساتھ راضی رہنا چاہئے مذکورہ آیت میں اسی کا بیان ہے۔ سالکین کے لئے خصوصاً یہ وعظ بہت مفید ہے۔

خلیل احمد تھانوی

۱۴/ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ قف یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا لا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ ط اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ط تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ط اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ○ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا وَادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴾(۱)

(۱)'' بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا وہ چھپادیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلیل ظاہر کر کے اور چپکے چپکے بھی البتہ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں جو حد سے نکل جائیں اور دنیا میں بعد اس کے کہ اس کی درستی کردی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور اس اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرو ڈرتے اور امید رکھتے ہوئے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک کام کرنے والوں سے'' سورۃ الاعراف:۵۴تا۵۶۔

تمہید

جن آیتوں کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے ان میں مقصود بالبیان صرف ایک جزو ہے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ باقی آیات جو اس سے سابق ہیں (۱) وہ محض ربط کے لئے پڑھی گئی ہیں، اور جو لاحق ہیں (۲) وہ تکمیل مضمون کے لئے تلاوت کی گئی ہیں۔ حاصل مضمون کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہر حال میں جو تعلق بندہ کا ہونا چاہئے ان آیات میں اس کا ذکر ہے اور یہ مضمون فی نفسہٖ (۳) ضروری بھی ہے اور آسان بھی بلکہ آسان گر بھی ہے (۴) کہ اُس پر عمل کرنے سے تمام دشواریاں سہل (۵) اور تمام پریشانیاں زائل (۶) ہوجاتی ہیں۔ اس لئے سبھی کو اس کی تعلیم دینا ضروری ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی طرف سے عام طور پر غفلت ہے عوام کی تو وہاں تک نظر ہی نہیں جاتی۔ لیکن خواص سے بھی توجہ کم ہے اور اس میں بہت کوتاہی ہورہی ہے۔

بات یہ ہے کہ جو تعلیم پرانی ہوجاتی ہے اُس کی طرف خواص کو بھی توجہ نہیں ہوتی تا عوام چہ رسد (۷)۔ گو اس مضمون پر عقیدہ تو سب کا ہے جو آج بیان کیا جائے گا۔ اور اعتقاد کی علامت یہ ہے کہ جس شخص سے بھی اس بیان تعلیم کو بیان کر کے پوچھا جائے گا کہ تم اس کو تسلیم کرتے ہو تو سب اس کو تسلیم کریں گے مگر اس کا استحضار نہیں ہے (۸)۔ اور یہ بھی غنیمت ہے کہ بیان کے بعد اس کو تسلیم کرلیتے ہیں ورنہ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے (۹) بیان کے بعد تسلیم کرلینا بھی اعتقاد کا ایک درجہ ہے گو دوسرا درجہ ہے جیسے جو شخص ایمان کی خود تفصیل نہ کرسکے۔ اس کے ایمان میں

(۱) اس سے پہلی آیات صرف ربط کے لئے پڑھی گئی ہیں (۲) اس کے بعد والی آیات مضمون کی تکمیل کے لئے تلاوت کی گئی ہے (۳) بذاتہ (۴) آسانی پیدا کرنے والا بھی (۵) آسان (۶) دور (۷) عوام تک وہ بات کیسے پہنچے (۸) ذہن میں حاضر نہیں (۹) اگر یہ حالت نہ ہوتی تو اور بڑی مصیبت تھی۔

علماء نے بحث کی ہے بعض نے تو تفصیل نہ کر سکنے والے کو کافر کہہ دیا ہے۔ مگر محققین نے کہا ہے کہ اگر خود تفصیل نہ کر سکے لیکن تفصیل کو سن کر تصدیق و تسلیم کر لے وہ بھی مومن ہے۔

اس وقت جو مسئلہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں اُس مسئلہ میں خواص کی وہ حالت ہے جو تفصیل ایمان میں عوام کی حالت ہے کہ جیسا اُن کو تفصیل ایمان مستحضر نہیں (۱)۔ مگر بعد بیان کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح علماء ظاہر کو یہ مسئلہ مستحضر نہیں۔ مگر بیان کے بعد تسلیم کر لیں گے۔ غرض اس کی طرف التفات (۲) نہ عوام کو ہے نہ خواص کو۔ مگر ضروری ہونا سب کو مسلم ہے (۳) سو یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ایک نہایت ضروری مسئلہ ہے اور اس کی طرف التفات نہیں۔

اقرارِ تصرف

حاصل اس مسئلہ کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے تصرف و اختیار کا اقرار و استحضار رکھنا چاہیئے (۴) اور ہر تصرف حق کے ساتھ راضی رہنا چاہیئے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ”خبردار خالق ہونا اور حاکم ہونا اسی کے لئے خاص ہے“ میں اسی کا بیان ہے کیونکہ یہ قاعدہ ثابت ہو چکا ہے کہ کلام مفید میں خبر سے مقصود انشاء ہوتا ہے اور اخبار محض مقصود نہیں ہوتا (۵)۔ جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ”کہہ دو کہ وہ اکیلا ہے“ خبر ہے لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اس کا اعتقاد رکھو۔ اسی طرح اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ”اے نبی کریم ﷺ آپ فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے“ سے مقصود مقتضاء یہ ہے کہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خالق و حاکم با اختیار ہونے کا اعتقاد رکھو جس کا حق تعالیٰ کی طرف

(۱) پیش نظر (۲) توجہ (۳) ضروری ہونے کو سب تسلیم کرتے ہیں (۴) یہ بات ہر وقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کا تصرف کرنے کا ہر وقت اختیار ہے (۵) صرف خبر دینا مقصود نہیں ہوتا۔

سے تو تصرف بھی ہو اس کے ساتھ رضا متعلق رہے (۱)

اگر یہ مقتضاء ظاہر نہ ہوگا تو یہ عدم اعتقاد یا ضعف اعتقاد کی علامت ہے (۲) کیونکہ ہر اعتقاد کا ایک اثر ہے جس کا ترتب اعتقاد پر لازم ہے (۳) مثلاً اپنے باپ کے متعلق کے جو اعتقاد ابوت (۴) کا ہے۔

اور اُس کا ایک اثر ہے کہ اُس کی تعظیم و ادب کو ملحوظ رکھا جائے اگر یہ اثر مرتب نہ ہوگا تو کہا جائے گا کہ یہ شخص باپ کو باپ نہیں سمجھتا۔ یا ابوت کے حقوق نہیں جانتا۔ اسی طرح اعتقاد خالقیت و آمریت کا (۵) مقتضیٰ یہ ہے کہ ہر تصرف حق کے ساتھ راضی رہے اور حق تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے اگر یہ اثر مرتب نہ ہوا تو اعتقاد معدوم یا ضعیف ہوگا (۶)۔ اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس مضمون کا گو اعتقاد تو سب کو ہے مگر استحضار بہت کم لوگوں کو ہے کیونکہ ہر معاملہ میں ہر حالت میں اس کا استحضار (۷) کون کرتا ہے کہ یہ تصرف حق تعالیٰ کا ہے اس لئے مجھ کو اس پر راضی رہنا چاہئے بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ بعض لوگوں کو کسی حالت یا کسی معاملے سے جو ناگواری ہوتی ہے اگر یہ ناگواری صرف اضطراری (۸) ہو تو یہاں تک بھی خیر ہے کیونکہ اس کو طبعی ناگواری پر محمول کیا جائے گا اور ناگوار سے طبعاً گرانی ہونا محل ملامت نہیں (۹)۔ لیکن غضب یہ ہے (۱۰) کہ بعض لوگوں کی ناگواری حد اعتراض کو پہنچ جاتی ہے جو اختیاری ہے یعنی وہ حق تعالیٰ پر اعتراض کرنے لگتے ہیں تو زبان سے کفریات بکنے لگتے ہیں۔ اور بعضے زبان سے تو کچھ نہیں کہتے۔ مگر دل

(۱) جو اس بات کی منتہی ہے کہ اللہ پاک کے یہ تصرف پر بندہ راضی رہے (۲) یہ اعتقاد نہ ہو یا اس کے ضعیف ہونے کی علامت ہے (۳) اعتقاد ہر نتیجہ مرتب ہونا ضروری ہے (۴) باپ ہونے کا اعتقاد (۵) اللہ کے خالق و آمر ہونے کا اعتقاد (۶) اعتقاد نہیں ہے یا کمزور ہے (۷) ہر وقت یہ بات کب پیش نظر ہوتی ہے (۸) ناپسندیدگی غیر اختیاری (۹) ناپسندیدہ بات طبعی طور پر ناگوار ہونا قابل ملامت نہیں (۱۰) افسوس ہے کہ۔

میں خدا تعالیٰ پر اعتراض ہوتا ہے۔ دل کھول کر(۱) اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی نہیں ہوتے۔ اور یہ سخت مرض ہے کہ جس کی سرحد کفر سے ملی ہوئی ہے اس لئے یہ مضمون نہایت ضروری ہے اور اس پر التفات دائم اور استحضار دائم لازم ہے(۲)۔ کہ حق تعالیٰ کو ہر تصرف کا اختیار ہے۔ اور بندہ کو اُس پر راضی رہنا چاہئے۔

ہر چند کہ یہ بیان پہلے بھی ہوا ہے جیسا کہ یاد پڑتا ہے مگر پہلے اس کا بیان ضمناً ہوا ہے آج اس کا بیان قصداً ہوگا یعنی پہلے دو چیزوں کا بیان ہوا ہے ایک اپنی تجویز وارادہ کو فنا کر دینا یہ جزو تو مقصوداً بیان ہوا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کی تجویز سے راضی رہنا یہ جزو ضمناً بیان ہوا ہے کیونکہ اپنی تجویز ورائے کے فنا کو یہ بات لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجویز کو مقدم سمجھے اور اس پر راضی رہے چونکہ یہ جزو پہلے جزو کو لازم تھا اس لئے استطراداً اس کا بیان بھی ہو گیا تھا۔ قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا۔

نیز پہلے بیان میں عنوان یہ تھا فنائے تجویز خود ورضا بتجویز حق(۳) اور آج دوسرا عنوان ہے۔ پہلا بیان بھی ضبط ہو چکا ہے صرف صاف ہونا اور طبع ہونا باقی ہے۔ اسباب مساعد(۴) ہوئے تو ان شاء اللہ جلد سامنے آ جائے گا۔

پریشانی کی اصل

میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تمام پریشانیوں کی اصل یہی ہے کہ انسان اپنے لئے بعض احوال وکیفیات وغیرہ تجویز کر لیتا ہے کہ یوں ہونا چاہئے اور یہ تمام پریشانیوں کی جڑ اس واسطے ہے کہ یہ تجویز کرنے والا گویا اُس ذات مقدس(۵) پر حکومت کرنا چاہتا ہے جو اس کے قبضہ میں نہیں بلکہ یہ تجویز

(۱) خوش دلی سے (۲) اس کی طرف ہر وقت توجہ کرنا اور اس کا ہر وقت پیش نظر رہنا ضروری ہے (۳) اپنی مرضی کو ترک کر کے اللہ کی تجویز پر خوش رہنا (۴) اسباب میسر آ گئے تو (۵) اللہ تعالیٰ پر۔

کنندہ(۱) خوداُس کے قبضہ میں ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے اپنے تصرف واختیار کو قرآن میں صاف صاف بیان کرکے انسان کے اختیار کی صاف صاف نفی کردی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی (۲)۔

ایک مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ط مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ ط سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (۳)

''ما کان لھم الخیرۃ'' میں صراحۃً اختیارِ عبد کی نفی ہے(۴) مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر(۵) کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو استعمال کا امر ہے(۶) بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں۔ جس کا عنوان ثانی تجویز ورائے ہے(۷) مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ یہ اچھا ہی ہوجائے پھر اُس کے ظہور وقوع کا انتظار کرنا(۸) کہ کب اچھا ہوگا۔ پھر تاخیر صحت سے پریشانی اور کلفت کا بڑھنا اُس کی تو ممانعت ہے: ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی﴾ (۹) میں اس تجویز کی جڑ کاٹی گئی ہے کہ دنیا وآخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تم کو ان میں تجویز کا کوئی اختیار نہیں اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اُس کے وقوع کا تقاضے کے ساتھ انتظار کیا جائے یعنی ایسا انتظار جس کی

(۱) یہ تجویز کرنے والا (۲) ''کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے پس خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا'' النجم: ۲۴، ۲۵ (۳) ''اور آپ ﷺ کا پروردگار جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے ان لوگوں کو تجویز احکام کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے'' (۴) واضح طور پر بندے کے اختیار کی نفی کی ہے (۵) مجبور ہونے کے مدمقابل اختیار (۶) اس اختیار کو استعمال کا تو حکم ہے (۷) اپنی طرف سے کسی چیز کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے کی ممانعت ہے کہ ایسا ہی ہوگا (۸) ظاہر اور واقع ہونے کا انتظار (۹) ''کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے پس خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا''۔

جانب مخالف کا تصور ناگوار ہو۔(۱)

حقیقت رجاء

یہ اس واسطے کہا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ میں انتظار الفرج بعد الشدۃ(۲) کی نفی کرتا ہوں سو خوب سمجھ لیجئے میں اس کی نفی نہیں کرتا کیونکہ یہ تو رجاء ہے(۳) بلکہ میں خاص انتظار کی نفی کرتا ہوں مثلاً کسی کا بچہ بیمار ہے تو اگر اس کو اس کی صحت کا ایسا انتظار ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظار مذموم ہے(۴) اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کی عدم صحت سے ناراض ہو اس پر اعتراض کرے اور اگر صحت وعدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ بھی کریں گے وہ عین حکمت ہے مگر دل چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حُزن ہے اور حُزن مذموم نہیں(۵) حزن تو رسول اللہ ﷺ کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضا بھی ہوتی ہے حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی(۶)۔ گو ظاہر میں ناگواری کی صورت ہو مگر دل میں ناراضی نہیں ہوتی۔ بلکہ رضا موجود ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا آپریشن بدوں کلورافام سنگھائے(۷) کیا ہو تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی چلائے گا بھی۔ ناک منہ بھی چڑھائے گا۔ مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ

(۱) اپنی تجویز کے مطابق کام کے ہونے کا اتنا شدید تقاضا ہو کہ اس کے خلاف کا تصور بھی ناگوار ہو (۲) کہ میں تنگی کے بعد فراخی کے انتظار کی نفی نہیں کرتا (۳) امید (۴) یہ انتظار برا ہے (۵) صحت نہ ہونے کے تصور سے رنج ہوتا ہے تو یہ غم ہے جو برا نہیں (۶) غم میں پریشانی اور اللہ سے شکایت نہیں ہوتی اگرچہ ناگواری کی صورت ہوتی ہے دل سے راضی ہوتا ہے (۷) بے ہوشی کی دوا سنگھائے بغیر اپریشن کر دیا۔

کراہت ظاہرہ کے ساتھ رضا مجتمع ہوسکتی ہے(۱) تو میں کراہت کی بھی نفی نہیں کرتا بلکہ میں صرف اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو(۲) کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہر میں بھی ناگواری ہو یہاں تک کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہوجائے(۳) تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت وشکایت ہونے لگے۔

اسی لئے ہمارے حاجی صاحب نے اس زمانہ میں مراقبہ توحید اصطلاحی سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے لئے محبت کاملہ کی ضرورت ہے جس سے محبوب کا ہر تصرف محبوب ہوجائے خواہ وہ تصرف ملائم طبع ہو یا ناملائم(۴) کیونکہ محبت کی یہ شان ہے کہ ؎

از محبت تلخا شیریں شود(۵)

اور عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من(۶)

تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل قربان ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے۔

مگر ایسی محبت آج کل کس میں ہے۔ بہت لوگ اس سے خالی ہیں۔ تو اس حالت میں اگر مراقبہ توحید(۷) اصطلاحی کیا گیا اور ہر فعل کو براہ راست بلاواسطہ اسباب حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھا گیا، اور فعل ہے ناگوار تو فاعل سے بھی

(۱) ظاہری ناگواری کے ساتھ رضاء وخوشنودی جمع ہوسکتی ہے (۲) اس ناپسندیدگی سے منع کرتا ہوں جن کے ساتھ رضا جمع نہ ہو (۳) حتی کہ اگر اس پر یہ بات کھل جائے کہ یہ کام اللہ نے کیا ہے تو اس سے بھی دشمنی وشکایت ہوجائے (۴) وہ کام طبیعت کے مطابق ہو یا خلاف (۵) محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب کی کڑوی بات بھی بھلی معلوم ہوتی ہے (۶) ''محبوب کی جانب سے جوامر بھی پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش ہے'' (۷) صوفیاء کی اصطلاح میں مراقبہ توحید یہ ہے کہ ہر فعل کو اللہ کی طرف سے بغیر اسباب سمجھے۔

ضرور ناگواری ہوگی۔ اسی لئے جس شخص میں محبت حق نہ ہو صرف معرفت ہی ہو اس کا ایمان خطرہ میں ہے۔ بہر حال انتظار مذموم وہ ہے جس کی شق مقابل نہ پسند ہو۔(۱) اور اگر شق ثانی ناپسند نہ ہو۔ یہ انتظار مذموم نہیں (۲) بلکہ وہ انتظار ہی نہیں صرف رجاء یا خیال کا درجہ ہے۔(۳)

اشراف نفس کی حقیقت

اور یہی تحقیق انتظار مذموم کی وہ بات ہے، جو میں نے ایک بزرگ سے بہاولپور کے سفر میں عرض کی تھی۔ اور وہ اس سے بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ نے بہاولپور کے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ مولوی رحیم بخش صاحب کی عادت ہے کہ جب ہم بہاولپور جاتے ہیں تو وہ کچھ ہدیہ دیا کرتے ہیں اور اس عادت کی وجہ سے پہلے سے کبھی یہ خیال بھی ہو جاتا ہے کہ وہ ہدیہ دیں گے۔ اب اس خیال کے بعد اُن کا یہ ہدیہ قبول کرنا اشراف و انتظار کی وجہ سے خلاف سنت تو نہیں۔

سبحان اللہ! یہ تدقیق اتباع سنت کی کیسے نصیب ہو؟(۴) یہ حضرت ہی کا کمال تھا ان کو اتنی دقیق باتوں پر نظر تھی اور دوسرا کمال یہ تھا کہ اپنے چھوٹوں سے اشکال کا حل چاہا۔ میرا کیا رتبہ تھا کہ حضرت کے اشکال کو حل کرتا۔ مگر محض ارشاد کی وجہ سے جواب عرض کیا۔ اس جواب کا حاصل یہی تھا کہ میں نے کہا حضرت انتظار مذموم یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کا وقوع ہو تو رنج ہو۔ فرمایا یہ تو بحمد اللہ نہیں ہے اگر وہ عمر بھر بھی خدمت نہ کریں تو مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کیا پھر

(۱) وہ انتظار ناپسندیدہ ہے جس کی جانب مخالف ناپسند ہو (۲) اگر دوسری جانب ناپسند نہ ہو تو ایسا انتظار ناپسندیدہ نہیں (۳) اس کو انتظار نہیں بلکہ امید کہتے ہیں (۴) سبحان اللہ اتباع سنت کی یہ باریکی کیسے نصیب ہو سکتی ہے یہ حضرت ہی کا خاصہ تھا۔

یہ اشراف نہیں بلکہ محض احتمال ہے اس پر مولانا بہت مسرور ہوئے اور اس تحقیق کو پسند فرمایا۔

طولِ امل

پس خوب سمجھ لیجئے کہ محض تصور ورجاء(۱) سے منع نہیں کیا جاتا ہے بلکہ تجویز ہندی(۲) سے منع کیا جاتا ہے جس کے خلاف سے رنج وملال ہو جیسے شیخ چلی کی حکایت ہے واللہ اعلم یہ کوئی شخص ہے بھی یا نہیں جیسے بعض مورخین کا قول ہے کہ مُلّا دوپیازہ کوئی تاریخی شخص نہیں محض فرضی نام ہے کیونکہ تواریخ معتبرہ(۳) میں اس کا ذکر نہیں پس میں شیخ چلی کے بارے میں بھی اس کا جزم نہیں کرتا کہ آیا وہ تاریخی شخص ہے اور یہ حکایت جو تیل کا گھڑا گر پڑنے کی عام زبانوں پر بیان کی جاتی ہے آیا واقعی حکایت ہے، ممکن ہے فرضی قصہ ہو مگر کارآمد بات کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (جیسے بعض حکماء نے پرندوں کی حکایات واقوال بیان کئے ہیں) غرض شیخ چلی کی جو حکایت مشہور ہے یہ طول امل اور تجویز میں داخل ہے اسی سے منع کیا جاتا ہے۔ (۴)

(۱) اچھی امید قائم کرنے سے منع کرنا مقصود نہیں ہے (۲) بلکہ ایسی امید قائم کرنے سے منع کیا جاتا ہے جیسی ایک ہندوستانی نے قائم کی تھی جس کا قصہ یہ ہے (۳) یہ ایک قول ہے جو نقل کردیا گیا۔ اس کے بعد ایک عزیز نے کسی انگریزی تاریخ سے ان کا پتہ لکھ کر دیا وہ پرچہ کہیں رکھ دیا اس وقت ملا نہیں ۱۲ (۴) شیخ چلی کی حکایت یہ ہے کہ اس نے کسی کا تیل کا گھڑا سر پر رکھ کر گھر تک پہنچانے کا معاملہ کیا دو پیسے مزدوری طے ہوئی اب اس نے امید قائم کی کہ ان پیسوں کے انڈے خریدوں گا ان سے مرغی کے بچے نکلواؤں گا پھر مرغیاں ہوں گی ان کے انڈے بیچوں گا پیسے ہوجائیں گے تو بکری لونگا پھر اس کا دودھ بیچ کر پیسے کماؤں گا پھر گائے خریدوں گا پھر اس کے دودھ سے مزید پیسے کماؤں گا پھر گھر بناؤں گا اور شادی کروں گا پھر بچے ہوں گے جب میرا بچہ آکر پیسے مانگے گا تو میں نہ کہہ کر منع کرونگا تو نہ کہتے وقت زور سے سر کو جھٹکا دیا تو تیل کا مٹکا سر پر سے گر پڑا اور تیل ضائع ہوگیا مٹکے والے نے کہا تو نے میرا تیل ضائع کردیا تو شیخ چلی کہتا ہے کہ تیرا تو دو آنے کا تیل ضائع ہوا اور میرا تو پورا خاندان ہی تباہ ہوگیا۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہوا ہو کہ محققین نے طول امل سے منع کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ طول امل علماء کے لئے مذموم (۱) نہیں مگر ان کی مراد خاص طول امل ہے جو حقیقت میں طول امل نہیں صورۃً طول امل (۲) ہے یعنی جس طول امل سے ممانعت ہے وہ ہے جو دنیا کی ہوس کے لئے ہو اور جس کی اجازت علماء کے لئے ہے، وہ وہ ہے جو خدمت دین کے لئے ہو چنانچہ ابھی واضح ہوتا ہے یعنی وہ یہ ہے کہ عالم یہ خیال باندھے کہ میں طالب علموں کی تکمیل کروں گا۔ عوام کی اصلاح کروں گا۔ فلاں فلاں مسائل میں کتابیں لکھوں گا یہ کام مدتوں کے ہیں۔ ان کے متعلق حدیث النفس بظاہر طول امل ہے لیکن دین کے لئے ہے۔

اشکال وجواب

اس پر اگر کوئی اشکال کرے کہ حدیث میں یہ استثناء کہ ''الطول الامل من العلماء'' کہاں ہے اور استثناء۔ بلا دلیل ایسا ہے جیسے مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہٗ کے یہاں درس حدیث میں جب بول آدمی کے نجس ہونے کی تحقیق ہوئی تو ایک بدعتی پنجابی طالب علم صاحب جلدی سے بولے۔'' الا بول الاولیاء'' کہ اولیاء کا پیشاب ناپاک نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ نامعقول حدیث میں یہ استثناء کہاں ہے اور بہت دھمکایا۔ مگر وہ اپنا کام کرکے خاموش بیٹھے رہے۔ غرض علماء کے طول امل کو جائز کہنا اور حدیث سے اس کو مستثنیٰ کرنا کہیں ایسا تو نہیں جیسا اس بدعتی پنجابی نے بول الاولیاء کو مستثنیٰ کیا تھا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس کو طول امل باعتبار ظاہر کے کہہ دیا گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ نیت عبادت کی ہے اور طول امل حقیقی کی اجازت کسی کو نہیں۔

(۱) لمبی امید قائم کرنا برا نہیں (۲) وہ صرف ظاہری طور پر لمبی امید ہے۔

اسی کے متعلق حدیث میں ہے: یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلاَ تُحَدِّثْنِیْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلاَ تُحَدِّثْنِیْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَعِدْ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ (۱)

''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا ''اسی حدیث کی تفسیر ہے مگر صوفیہ نے روایت بالمعنیٰ کے طور پر اس جملہ کو بھی حدیث کہہ دیا ہے یہ لفظ حدیث میں وارد نہیں (۲)۔ ہاں اس کے معنی حدیث میں موجود ہیں۔ اس حدیث سے طول امل کی ممانعت صاف معلوم ہورہی ہے۔ بلکہ ایک دن کے لئے بھی تجویز کی اجازت نہیں طول امل تو بہت دور ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کی بھی اجازت نہیں تدبیر تو ایک دن کیا بعض تدبیر ایک سال کے لئے بعض تدبیر صدیوں کے لئے بھی جائز ہے چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی ازواج کو سال بھر کا نفقہ ایک دم (۳) سے دیا ہے مگر اس تجویز کی اجازت نہیں کہ تم اپنے واسطے ایک شق ایک حالت معین کرکے رائے قائم کرلو کہ بس یوں ہونا چاہیے۔ اس کا تم کو کیا حق ہے کیا خدا تعالیٰ پر حکومت کرنا چاہتے ہو؟

طولِ امل کا اثر

یہ تو کلام تھا طول امل کی حقیقت کے متعلق اب اُس کے اثر وغایت میں غور کیجئے کہ اس طول امل کی جو غرض ہے یعنی ترقی اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کو تو ترقی ہے اور پچاس کا ضرر (۴) ہے جس کی نسبت ایک میاں جی نے کہا تھا کہ سب روؤ۔ قصہ یہ ہوا کہ میاں جی ایک گاؤں میں کسی غریب زمیندار کے گھر ۲ روپے اور کھانے پر ملازم تھے وہ زمیندار تنگی معاش کے سبب ملازمت کی فکر میں

(۱) ''اے عبداللہ! جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں کچھ تجویز نہ کرو اور جب شام ہو تو صبح کی کچھ فکر نہ کرو اور اپنے کو اصحاب قبور میں شمار کرو'' (۲) یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں (۳) سال بھر کا خرچہ (۴) نقصان۔

باہر چلا گیا اور بہت دنوں کے بعد اُس کا خط آیا کہ میری تنخواہ پانچ سو روپے ہوگئی ہے۔ یہ خط گھر میں (۱) سے بچہ کے ہاتھ میاں جی کے پاس بھیجا گیا کہ ذرا دروازہ پر آکر خط پڑھ دو کیا لکھا ہے سارے گاؤں میں خط پڑھنے والے وہی تھے میاں جی نے خط پڑھ کر رونا شروع کیا۔ زمیندار کی بیوی گھبرائی کہ خیر تو ہے کیا لکھا ہے۔ میاں جی نے کہا بتلاؤں گا تو بھی رو۔ وہ بھی رونے لگی۔ اس پر سارا گھر جمع ہوگیا اور یہ سوچ کر کہ کوئی غم کا قصہ ہے سب رونے لگے۔ یہ کہرام سن کر محلّہ والے اکٹھے ہوگئے کہ کیا بات ہے میاں جی نے کہا بتلاؤں گا تم بھی رو۔ وہ بھی رونے لگے پھر ایک شخص نے کہا کہ بات تو بتلاؤ کیا لکھا ہے کہا خط میں یہ لکھا ہے کہ میری تنخواہ پانچ سو روپے ہوگئی ہے لوگوں نے کہا کمبخت یہ بات رونے کی تھی یا خوشی کی میاں جی نے کہا تم سمجھے نہیں یہ بات رونے کی ہی ہے۔ میرے لئے تو اس واسطے کہ اب وہ اتنی تنخواہ کے بعد اپنے بچوں کو انگریزی پڑھائیں گے کوئی قابل ماسٹر ان کے واسطے بلائیں گے مجھے الگ کردیں گے اور بیوی کے لئے اس واسطے کہ اب وہ اس گاؤدی بیوی سے کیا خوش ہوگا کوئی تعلیم یافتہ عورت ڈھونڈے گا۔ اس کو طلاق دے گا یا باندی بنا کر رکھے گا۔ اور تمہارے واسطے اس لئے کہ اب وہ بہت سا روپیہ لے کر آئے گا۔ اور اپنا مکان عالی شان بنائے گا جس کے لئے تمہارے مکانات خرید کر ان کو اصطبل اور بیٹھک میں شامل کرے گا۔ بتلاؤ یہ بات خوشی کی ہے یا رونے کی۔

واقعی میاں جی نے بات تو ٹھکانے کی کہی۔ جب کانپور میں مدرسہ بڑھنے لگا تو سچ یہ ہے کہ محلّہ کے مکانات پر ہماری نظر تھی کہ یہ مکان بھی مدرسہ میں آجائے وہ بھی آجائے اور بعض مکانات کے لئے خریدنے کا پیام بھی دیا جو اہل مکان کو ناگوار گزرا۔ مگر پھر وہ مکان مدرسہ میں ہی آگیا۔ یہ طول امل اس کا انجام

(۱) خط لکھنے والے کی بیوی نے۔

ہے کہ ایک کی ترقی ہے اور دَس آدمیوں کا ضرر ہے۔

لطافت شریعت

اور یہ وہ مرض ہے جو ہمارے ساتھ تمام معاملات میں لگا ہوا ہے اور اسی لئے پریشانی ہوتی ہے کیونکہ رنج خلاف توقع سے ہوتا ہے اگر آپ کو کسی سے یہ توقع ہو کہ میری تعظیم کرے گا۔ اس کے خلاف سے رنج ہوگا اور اگر توقع کچھ نہ ہو تو کچھ رنج نہ ہوگا۔ یہی تفویض کا حاصل ہے کہ تجویز و توقع کو قطع کر دیا جائے (۱)۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمام فلاسفہ کی کتابیں چھان مارو۔ راحت کا جو طریق شریعت نے بتلایا ہے وہ کہیں نہ ملے گا۔ مگر شریعت سے تو لوگوں کو جاڑا چڑھتا ہے (۲) حالانکہ اس کے حسن کی یہ شان ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل من می کشد جا اینجا است (۳)

مگر شریعت کا حسن سادگی کے ساتھ ہے بناوٹ کے ساتھ نہیں۔ اسی لئے سطحی نظر والوں کی نظر میں وہ نہیں آتا عارف فرماتے ہیں ؎

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　اے خوشا سرو کہ از بندغم آزاد آمد (۴)

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بسند　　دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد (۵)

اور متنبّی کہتا ہے ؎

حُسْنُ الْحِضَارَةِ مَجْلُوْبٌ بتطرِيةٍ　　وَفِی الْبَدَاوَةِ حُسَنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبِ (۶)

---

(۱) اپنے لئے کوئی حالت خود مت تجویز کرو بلکہ اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دو جس حال میں رکھیں خوش رہو اس کو تفویض کہتے ہیں (۲) شریعت پر عمل پیرا ہونا تو لوگوں کو مشکل لگتا ہے (۳) ''سر سے پاؤں تک (اول سے آخر تک) جس جگہ نظر کرتا ہوں میرے دل کا شوق دامن کھینچتا ہے کہ جگہ یہی ہے'' (۴) ''پھل والے درخت زیر بار ہوتے ہیں، سرو بہت اچھا ہے کہ اس غم سے آزاد ہے'' (۵) ''دل کو لبھانے والی نباتات، (جڑی بوٹیاں) تمام زیور پہنے ہیں، میرا معشوق ہے کہ حسن خداداد رکھتا ہے'' (۶) ''بذریعہ میک اپ حسن حاصل کرنا تو ایک قسم کی قید ہے میرا محبوب ایسا ہے کہ قید غم سے آزاد ہے''۔

بناؤ سنگھار سے حسن پیدا کرنا تو بازاریوں کا پیشہ ہے حُسن وہ ہے جو اس کا محتاج نہ ہو ۔

زعشق ناتمام ماجمال یار مستغنی ست
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا(۱)

قدرتی حسین کو بناؤ سنگھار کی اصلاً احتیاج نہیں ہوتی وہ سادگی میں بھی عجیب دلربا ہوتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کچھ زینت بھی ہو جائے تو نُور علی نُور ہے مگر ایسی زینت نہ ہو کہ سیر بھر کے کڑے پیروں میں ہوں (۲) بلکہ وہ بھی لطیف ہو۔ تو شریعت مقدسہ میں حسین اصلی کے ساتھ زینت بھی ہے۔ مگر لطیف غرض اس کا حسن بھی لطیف ہے اور زینت بھی لطیف ہے جس کو اہل لطافت ہی ادراک کرتے ہیں۔

دیہاتیوں کا مزاج

بھدی طبیعتوں کو اگر اس کا ادراک نہ ہو تو ان کی ایسی مثال ہے جیسے مولانا محمد یعقوب صاحب سے میں نے حکایت سنی ہے کہ شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند کی تقریب شادی میں اُن کے والد شیخ کرامت حسین نے مہمانوں کو پلاؤ زردہ فِرنی کھلایا کچھ رعایا کے چمار بھی بیگار میں آئے تھے۔ اُن کو بھی دینے کا حکم دیا۔ وہ لوگ گڑ کے کھانے والے اُن کو زردہ کی کیا قدر ہوتی۔ مگر خیر ناک منہ چڑھا کر زردہ تو کھالیا۔ لیکن جب فِرنی کھانے لگے تو اُن سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے یہ تھوک سا گے ہے (کیا ہے ۱۲) پہلے لوگ کمینوں (۳) کو بھی وہی کھانا کھلاتے تھے جو خود کھاتے تھے۔ اُن کے واسطے الگ کھانا نہیں پکتا تھا جیسا کہ آج کل کے بعض رؤسا کا دستور ہے۔

(۱) ''یار کا جمال (خوبصورتی) ہمارے ناکام عشق سے علیحدہ ہے خوبصورت آدمی کے لئے خد وخال اور رنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے'' (۲) پیروں میں ایک سیر وزن کے زیور پہنے ہوئے ہوں (۳) غرباء۔

غرباء کا اکرام

مولانا عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی تو کمینوں کو کمین بھی نہ کہتے تھے۔ بلکہ متعلقین کا لفظ فرمایا کرتے تھے کہ متعلقین کو کھانا کھلادو۔ متعلقین کو غلہ دیدو۔ یہ اسلامی تہذیب ہے کیونکہ اپنے سے چھوٹے کو ذلیل کرنا اور ذلیل لقب سے یاد کرنا اس کا دل توڑنا ہے آدمی سب ایک باپ ماں کی اولاد ہیں۔ معزز وہ ہے جو خدا کے یہاں معزز ہو۔ اور ذلیل وہ ہے جو خدا کے یہاں ذلیل ہو ہم کو کسی کے ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا خبر انجام کس کا کیسا ہے۔ باقی امور انتظامیہ میں فرق یہ اور بات ہے یہ گفتگو درمیان میں آگئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ چماروں نے فِرنی کو تھوک سا بتلایا تھا کیونکہ وہ بھدی طبیعت کے تھے۔ اُن کو لطیف غذاؤں کی لطافت کیا معلوم ہوتی۔ اسی طرح شریعت کی لطافت کے ادراک کو لطیف دماغ کی ضرورت ہے۔ بھدے لوگ شریعت کی لطافت کو کیا سمجھیں۔ واللہ شریعت نہایت حسین ہے تم اس سے گھبراؤ نہیں۔ شریعت کے برابر کوئی تعلیم حسین نہیں۔

تجویز وتفویض

میں آج کل کے محاورہ کے موافق چیلنج دیتا ہوں کہ تلخی کا شیریں کرنے والا بجز منزل وحی یا من منزل علیہ الوحی (۱) کے کوئی نہیں۔ اور واقع میں تو یہاں بھی حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں (۲) مگر بظاہر حضور ﷺ کا واسطہ ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ایسی تعلیم نہیں کرسکتا جو تلخ کو شیریں کردیں اور وہ تعلیم تفویض ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردے اور اپنے لئے کوئی حالت خود تجویز نہ کرے۔ میں ناگواری کی

(۱) تلخ کو شیریں بنانے والا سوائے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے (۲) اصل تو اللہ ہی کرنے والے ہیں۔

نفی نہیں کرتا کہ تفویض کے بعد ناگواری پیش نہ آئے گی بلکہ اس کا اثبات کرتا ہوں کیونکہ اس سے میرا مقصود زیادہ عجیب ہوجاتا ہے کہ ناگواری بھی پیش آئے گی۔ مگر اُس کا اثر ظاہر نہ ہوگا بلکہ عین تلخی میں شیرینی ولذت ہوگی۔ یہ وہ مضمون ہے جو پہلے بیان نہیں ہوا پہلے (ایک وعظ میں) یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ اپنی تجویز کو فنا کردو۔ اور اس کے لئے تفویض لازم نہیں کیونکہ فنائے تجویز وتفویض میں جانبین (۱) سے تلازم نہیں بلکہ تفویض الی الحق کے لئے تو فنا تجویز لازم ہے مگر فنائے تجویز کے لئے تفویض الی الحق لازم نہیں (۲) کیونکہ احتمال تفویض الی الغیر کا بھی ہے گو یہ احتمال طالب حق میں ضعیف ہے کیونکہ فنائے ارادہ وفنائے تجویز احتراز عن الشرک (۳) کے لئے کیا جاتا ہے اور جو شخص شرک سے بچنے کے لئے اپنے ارادہ وتجویز کو فناء کردے گا وہ غیر حق کی طرف تفویض کیسے کرے گا۔ کیونکہ تفویض الی الغیر تو شرک ہے (۴)۔ غرض ہر چند کہ تحقیق کے اعتبار سے یہ احتمال ضعیف ہے مگر نفس مفہوم کے اعتبار سے احتمال تو ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ طرفین سے لزوم نہیں صرف ایک طرف سے لزوم ہے پس اگر میں اولاً تفویض کا بیان مقصوداً کر چکتا تو اس کے بعد قطع تجویز وفنائے ارادہ کا بیان نہ کرتا۔ لیکن پہلے قطع تجویز وفنائے ارادہ کا بیان ہوا ہے اور اس کے لئے تفویض لازم نہیں اس لئے آج تفویض کا بیان قصداً کرتا ہوں۔

اور اس تفویض کی ضرورت کا اعتقاد تو سب کو ہے مگر اعتقاد کا ثمرہ تو مطلق دخولِ جنت (۵) ہے گو آخر ہی میں ہو۔ باقی ایک ثمرہ تفویض کا جو عاجلہ بھی ہے یعنی دنیا میں

(۱) ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم نہیں (۲) اللہ کے سپرد کرنے میں تو اپنی تجویز کی نفی لازم آتی ہے لیکن اپنی تجویز کی نفی سے اللہ کے سپرد کرنا لازم نہیں آتا کیونکہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ خود کو خدا کے علاوہ کسی کے سپرد کردے (۳) شرک سے بچنے کے لئے (۴) اپنے کو غیر اللہ کے سپرد کرنا تو شرک ہے (۵) اس اعتقاد کا نتیجہ جنت میں داخلہ ہے۔

راحت حاصل ہونا اور باعتبار آخرت کے کاملہ بھی ہے وہ محض اعتقاد سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے استحضاء دائم کی (۱) ضرورت ہے اور اسی کا بیان اس وقت مقصود ہے۔

تفویض بغرضِ راحت

پھر اہل تفویض میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو صاحب تفویض اس لئے ہیں تا کہ راحت حاصل ہو۔ اور چونکہ راحت ایک دنیوی مقصود ہے اس لئے ان کی مثالیں کاملین کے سامنے جن کا ذکر عنقریب آتا ہے۔ ایسے ہے جیسے ایک دیہاتی کو کسی مولوی صاحب نے نماز کی تاکید کر دی تھی وہ نماز پڑھنے لگا۔ مولوی صاحب کا جو دوبارہ گزر ہوا اس سے پوچھا کہ نماز جاری ہے یا چھوڑ دیا۔ کہا اللہ تیرا بھلا کرے تو نے بڑا اچھا نسخہ بتایا یار مجھے بادی پھولنے کا مرض تھا جو بہت ستاوے تھا۔ اب جب سے نواج (نماز) شروع کی ہے جب ہی سجدہ میں موندھا (اوندھا) پڑوں جب ہی بادی ٹکڑے (نکلے) بھلا پھر میں نماز کیوں چھوڑتا۔ (اس حکایت پر سب لوگ ہنسنے لگے فرمایا کہ) جیسے اس دیہاتی پر آپ لوگ سب ہنستے ہیں ایسے ہی کاملین ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو محض راحت کی غرض سے تفویض اختیار کرتے ہیں۔

حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ حالانکہ کاملین سے نہیں۔ کیونکہ کمال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ حالت ہو جو شخص جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہوگا۔ اتنا ہی کامل ہوگا اور حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ پر احوال ومواجید کا غلبہ تھا۔ اور غلبہ حال میں خلاف سنت اقوال اُن سے صادر ہوئے۔ گو یہ معذور تھے۔

چنانچہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ منصور رحمۃ اللہ علیہ ایک ورطۂ (۲)

(۱) ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے (۲) ایک پریشانی میں مبتلا تھا۔

میں تھا۔ افسوس کسی نے اس کی دستگیری نہ کی (۱) اگر میں اس وقت ہوتا تو اسے ورطہ سے نکال دیتا اور ہمارے سلسلہ کے بزرگ شیخ عبدالحق رودلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ

منصور رحمۃ اللہ علیہ بچہ بود کہ ازیک قطرہ بفریاد آمد

ایں جا مردانند کہ دریاہا فروبردہ اندوآروغے نہ زدند (۲)

بہرحال گو یہ کامل نہیں مگر اہل طریق سے ہیں انہوں نے ایک سالک سے پوچھا۔ کس شغل میں ہو کہا مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں۔ فرمایا کہ ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہے۔ فَاَیْنَ الْمُحَبَّۃُ یعنی محبت کا وقت کب آئے گا۔ توکل کے قبل تو کھانے کمانے اور پیٹ بھرنے کی فکر تھی اور اب فکر بطن سے قطع نظر کی فکر ہے (۳) یہ بھی فکر بطن ہی ہو۔ گو بصورت اثبات نہیں بصورت نفی سہی۔ غرض جس طرح یہ فکر مجذوب تصحیہ توکل کو پیٹ کا دھندا بتلاتے ہیں اسی طرح محققین تفویض بغرض راحت کو دنیائے محض کہتے ہیں۔

کمال عبدیت

دوسرا فرقہ محققین کا ہے جو تفویض کے طالب محض اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق بندہ پر ہیں منجملہ ان کے یہ حق بھی ہے کہ بندہ اپنے ارادہ اور تجویز کو ان کے ارادہ اور تجویز میں فناء کر دے اُن کو محض عبدیت مطلوب ہے اور حق الوہیت کا ادا کرنا یہی عبدیت (۴) ہے اور کمال عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔ واقعی اُن کا وظیفہ ہر حالت میں یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ جو

(۱) کسی نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما (۲) ''منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں اچھل پڑا یہاں ایسے لوگ ہیں کہ دریا پی گئے اور ڈکار تک نہ لی'' (۳) اب کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہونے کی فکر ہے (۴) حق معبودیت کو ادا کرنا ہی عبدیت ہے۔

تصرف اُن کے اندر کریں اس پر راضی رہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ اس سے کیسی راحت ہوتی ہے جہاں اس کا تصور ہوا کہ یہ تصرف حق ہے بس برف سا دل پر رکھا جاتا ہے۔(۱)

حضرت! یہ تو بندہ کے اختیار میں نہیں کہ اس کو ناگوار امور پیش نہ آئیں مگر ناگوار کو گوارا بنا دینا تو اس کے لئے ممکن ہے۔ سالکین کو بہت سی سخت حالتیں پیش آتی ہیں۔ بعض ناگوار امور بھی اُن کو طریق میں پیش آتے ہیں۔

تکمیل تام

چنانچہ ایک مشترک ناگواری کو مثال کے طور پر ذکر کرتا ہوں وہ یہ کہ ہر شخص اپنی حالت کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ تکمیل تام کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہر شخص تکمیل تام کا طالب ہے ہاں اکثر کو کسی خاص خاص بات میں کمال حاصل ہوجاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو حب مال سے نجات حاصل ہوگئی اور زہد میں کمال ہوگیا۔ مگر اہل وعیال کی محبت میں مبتلا ہے۔ تو اس کا کمال ایسا ہوگا۔ جیسے ایک شخص معقول (۲) میں کامل ہے۔ مگر فقہ وحدیث سے کورا ہے۔ تو اس کا کمال کنزالدقائق پڑھاتے ہوئے کھل جائے گا۔ وہاں مُسْتَحَبُّهُ التَّيَامُنُ کی تفسیر میں یہ کہے گا کہ وضو میں اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ پر ایمان لایا) کہنا مستحب ہے اور حدیث پڑھاتے ہوئے عبدالرحمٰن بن عوف کے قصہ نکاح میں رأی عَلَيْهِ اَثَرُ الصُّفْرَةِ کی تفسیر میں یہ کہے گا کہ مبالغہ فی الجماع کی وجہ سے چہرہ پر زردی آگئی تھی۔ میں نے دوسرا قصہ مولانا محمود حسین صاحب سے اور پہلا قصہ ایک اور راوی سے سنا تھا کہ کسی معقولی نے اس کی یہی تفسیر کی تھی اور اس کے برعکس اگر منقولی معقول پڑھائے گا تو وہ قطبی میں

(۱) دل ٹھنڈا ہوجاتا ہے (۲) علم منطق وفلسفہ۔

تصدیق کے متعلق امام رازی کے مذہب کی نقل میں قال الامام سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مراد لے گا تو کمال یہ نہیں کہ ایک ہی عضو حسین ہو بلکہ حسن یہ ہے کہ مجموعہ حسین ہو۔ ورنہ اگر کوئی حسین ہو اور کوئی غیر حسین تو اہل معقول کے قاعدہ پر تو مرکب حسین وقبیح کو قبیح ہی کہتے ہے۔(۱)

اس بات پر ابھی ہفتہ عشرہ(۲) ہی میں تنبّہ ہوا ہے کہ بعض ملکات کے کامل ہونے کا نام کمال نہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ سب ملکات کامل ہوں چونکہ یہ بات بڑی قابل قدر ہے اور علم عظیم ہے اس لئے میں دوستوں کو اس پر تنبیہ کرتا ہوں کیونکہ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ چند ملکات کے کمال کو کمال سمجھ لیتے ہیں۔

ضرورتِ مراقبہ تکمیل

مثلاً میرے اندر بحمداللہ تعلق مع المال اس حیثیت سے تو کم ہے کہ مجھے تحصیل مال کی زیادہ فکر نہیں اس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے مال کی محبت نہیں ہے مگر بعض دفعہ یہ بات دیکھی کہ اگر باوجود احتیاط کے کچھ مالی نقصان ہوگیا تو زیادہ قلق نہیں ہوا۔ لیکن اگر بے احتیاطی سے کچھ نقصان ہوگیا تو قلق زیادہ ہوتا تھا۔ ایک دن مجھے اس پر تنبہ ہوا کہ یہ تو ناقص حالت ہے۔ آخر نقد مال پر اتنا زیادہ قلق کیوں ہے۔ اس وقت جو کچھ میرے دل پر حالت گزری کچھ نہ پوچھئے اور اس مرض کے علاج کی فکر ہوئی کہ اس قلق کا علاج ہونا چاہئے بس فوراً ہی قلب پر اس قلق کا علاج وارد ہو، الہام کا لفظ تو بڑا لفظ ہے میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا ہاں وارد(۳) کہتا ہوں کہ اس وقت یہ علاج وارد ہوا کہ یہ بھی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ بے احتیاطی

(۱) اچھائی اور برائی کے مجموعہ کو برا ہی کہتے ہیں (۲) ہفتہ دس دن پہلے ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ بعض خوبیوں کے حاصل ہونے کا نام کمال نہیں ہے بلکہ سب صفات عمدہ ہوں تو کمال ہے (۳) یعنی میرے دل میں یہ خیال آیا۔

کی حالت میں یہ نقصان ہوگیا بس یہ تصور کرنا تھا کہ ایک ہی جلسہ (۱) میں مرض کی اصلاح ہوگئی اور وہ جوزیادہ قلق ہوتا تھا۔ معاً جاتا رہا۔

اس کے بعد یہ قلق ہوا کہ ہائے ہم اب تک ناقص ہی رہے اس کا علاج بھی اسی وارد سے کیا کہ یہ بھی تصرف حق ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہئے۔ اس سے دوسرا قلق بھی جاتا رہا۔ اب بتلایئے اس علاج کی ضرورت ہر شخص کو ہے یا نہیں کیونکہ پورا کمال کس کو حاصل ہے کسی نہ کسی وقت کسی شعبہ میں نقصان کا ضرور مشاہدہ ہوگا پھر اس پر قلق بھی ہوگا اگر اللہ تعالیٰ دستگیری نہ فرماتے تو نہ معلوم اس قلق کا نتیجہ کیا ہوتا مگر فوراً ہی اس وارد نے دل پر برف سا رکھ دیا اب تم ہر نا گوار امر میں اس تصور سے کام لو، ان شاء اللہ بہت نفع ہوگا۔

مراقبہ تقدیر

شاید کوئی یہ کہے کہ پھر ازالۂ نقص کی تدبیر ہی کی کیا ضرورت ہے مجاہدہ وریاضت کی کیا حاجت ہے بس جیسا خدا نے ملکہ دیدیا اسی پر راضی رہنا چاہئے۔ تکبر دیا تو اس پر راضی۔ بخل دیا ہو تو اس پر خوش۔ کیونکہ تصرف حق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ترک تدبیر کی تم کو اجازت نہیں تم تدبیر کے مامور (۲) ہو اس لئے تدبیر واجب ہے ہاں تدبیر کے بعد بھی اگر نقص رہے گا تو یہ بھی تصرف حق ہے اس پر راضی رہو۔

اور یہاں سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ کوئی یوں کہتا کہ گناہوں پر بھی راضی رہنا چاہئے کیونکہ یہ بھی تصرف حق ہے اور موافقت کی تقدیر ہے۔ تو سمجھ لو کہ عین گناہ

(۱) ایک ہی نشست میں (۲) تمہیں تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

کے وقت یا گناہ سے پہلے عزم کے وقت اس تصور سے کام نہیں لے سکتے کیونکہ تم کو ابھی سے کیا خبر ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے یہ تصرف مقدر کیا ہے کہ فلاں گناہ کروگے نیز جس وقت تم گناہ کرتے ہو اس وقت موافقت تقدیر کی نیت کب ہوتی ہے۔(۱) اس وقت تو اپنی خواہش کا پورا کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ قبل از وقوع تقدیر کی خبر کس کو ہے یہی جواب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو دیا تھا (ذکرہ بعض اہل الفریق) جب کہ شیطان نے کہا کہ آپ نے تو میرا سجدہ نہ کرنا مقدر ہی کیا تھا تو اگر میں نے اس تقدیر کے موافق سجدہ نہ کیا تو مجھ پر لعنت وغضب کیوں ہوا وہاں سے ارشاد ہوا کہ کمبخت موافقت تقدیر کا علم تو بعد وقوع کے تجھ کو ہوا وقوع کے وقت تو تو نے اس کا قصد نہیں کیا۔ بہرحال گناہ کے وقت اس مراقبہ سے کام نہیں لے سکتے ہاں گناہ ہوجانے کے بعد توبہ نصوح کر کے بھی جب قلق زائل نہ ہو(۲) اور اس قلق سے تعطل فی الاعمال کا اندیشہ(۳) ہو تو اس وقت اس مراقبہ سے کام لو اور زیادہ قلق میں نہ پڑو۔

یہ طریقہ ہے اس نسخہ کے استعمال کا طریقہ علاج تو صاف وصریح ہے۔ مگر کوئی قصداً ہی اُلٹا علاج کرنا چاہے تو وہ جانے۔ جیسے میرٹھ میں ایک دیہاتی رئیس ایک شہری رئیس سے ملنے آئے اُن کے سامنے بڑا قیمتی عطر پیش کیا گیا تو اس دیہاتی رئیس نے عطر کو چاٹ لیا تو ایسے عقلمندوں کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ بہرحال یہ مراقبہ نہایت ضروری ہے اس پر دوام رکھو(۴) ان شاء اللہ سب پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر دوام شرط ہے یعنی کسی وقت اس سے غافل نہ ہو۔

(۱) گناہ کرتے وقت یہ نیت کب ہوتی ہے کہ یہ گناہ اس لئے کررہا ہوں کہ میری تقدیر سے موافقت ہوجائے کیونکہ اس کا علم ہی نہیں ہے، صرف خواہش نفس کی تکمیل مقصود ہوتی ہے (۲) سچی توبہ کر کے بھی رنج دور نہ ہو تو پھر اس مراقبے سے کام لو (۳) اور اس ابتلاء گناہ کے غم سے اعمال میں خلل پڑنے لگے تب یہ تصور کرو کہ میری تقدیر میں یوں ہی تھا (۴) ہمیشہ یہ مراقبہ کرتے رہو۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی[۱]
ہر آنکہ غافل از حق یک زماں ست دراندم کافر ست امانہاں ست[۲]

دوامِ تفویض

شاید کوئی کہے کہ یہ تو بہت مشکل ہے تو سمجھ لیجئے کہ دوام کی تفسیر میں جو ہر وقت کا مفہوم ہے یہ استغراق ہر چیز میں جدا ہے پس ہر چیز کا دوام جدا جدا ہوا[۳]۔ بعض امور کا دوام تو اسی طرح ہوتا ہے۔ کہ کسی وقت غافل نہ ہو ہر وقت استحضار رہے۔ جیسے علم حضور میں۔ اور بعض امور کا دوام یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ پیش آیا۔ اُس وقت اُس کا استحضار کرلیا۔ چنانچہ اس مراقبہ کے لئے یہی دوام مطلوب ہے کہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے اس وقت اُس کو فوراً حاضر فی الذہن[۴] کرلیا جائے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے اور ایک قسم دوام کی یہ ہے کہ بعد حصول وعزم عدم ترک[۵] کے اُس کی ضد کا ارادہ نہ ہو۔ جیسے ایمان کا دوام یہی ہے کہ قلب ارادۂ کفر سے خالی ہو۔ بس جب تک کفر کا ارادہ نہ ہوگا۔ اُس وقت تک ایمان باقی ہے۔ اور اُس کو دوام حاصل ہے گو یہ شخص سو رہا ہو یا دُنیا کے کاروبار میں مشغول ہو کہ ایمان کی طرف التفات بھی نہ ہو۔ مگر سوتے ہوئے اور چلتے پھرتے دکانداری کی باتیں کرتے ہیں۔ ہر حال میں مؤمن ہے جیسے مشی فعل اختیاری ہے[۶] اور ہر قدم کی تحریک فعل اختیاری ہے[۷] لیکن اس کے باوجود مشاہد ہے کہ ہر قدم پر قصد نہیں ہوتا اور مشی کا وقوع ہوتا رہتا ہے[۸]۔ سو یہاں بھی وہی اصل ہے کہ شروع ہی

(۱) ''اس بادشاہ (یعنی اللہ) سے تھوڑی دیر کے لئے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری طرف متوجہ ہو اور تجھ کو خبر نہ ہو'' (۲) ''اللہ سے جو شخص تھوڑی دیر کے لئے غافل ہوجائے اس وقت وہ اندرونی طور پر کافر (نافرماں) ہے'' (۳) ہر وقت پیش نظر رہنا (۴) دماغ میں حاضر کرلو (۵) اس کے حاصل ہوجانے اور اس کو ترک نہ کرنے کا پختہ ارادہ ہونے کے بعد اس کی ضد کا خیال نہ آئے (۶) پیدل چلنا فعل اختیاری ہے (۷) ہر قدم اٹھانا فعل اختیاری ہے (۸) ہر قدم اٹھاتے وقت اس کا ارادہ نہیں ہوتا لیکن قدم اٹھتے رہتے ہیں۔

میں تحصیل مشی وعدم توقف کا قصد کرلیا وہی ختم مشی تک حصول مقصود کے لئے کافی ہوگیا(۱)۔ چنانچہ ہم چلتے ہوئے باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ اخبار بھی دیکھتے رہتے ہیں اور مشی (۲) بھی برابر جاری ہے۔ بہرحال ہر شئے کا دوام جدا ہے۔ پس تفویض کا دوام یہ ہے کہ ضرورت کے وقت اس کا استحضار ہوجاوے لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ وقت ضرورت پر استحضار ہوجانا۔ اس کا حصول بھی اس پر موقوف ہے کہ چندروز ہر وقت اس کا استحضار اور مراقبہ رہے اور بدوں اس کے رسوخ نہیں ہوتا اور بدوں رسوخ، وقت پر بھی استحضار نہیں ہوتا۔

سوال وجواب

اب رہا یہ سوال کہ جتنی مدت تک یہ مراقبہ ہر وقت کا رہے گا۔ اس مدت میں دوسرے کام کیسے ہوں گے۔ کیونکہ دوسرے کام بھی توجہ پر موقوف ہیں تو دو طرف کیسے توجہ ہوگی۔ جواب یہ ہے کہ تکلف سے ایسا ہونا ممکن ہے اور حکماء کا قول کہ دوطرف توجہ نہیں ہوتی ماؤل ہے(۳) کہ سہولت سے نہیں ہوتی ورنہ وہ قول غلط ہے اور اس قول پر کوئی دلیل نہیں۔ جس کو شک ہو وہ اس کو شروع کرکے دیکھے خود اس کے امکان اور وقوع سب کو مان لے گا۔ باقی جو لوگ بدوں(۴) کام شروع کئے اس کو محال(۵) کہنے لگتے ہیں اُن کو یہی جواب دیا جائے گا کہ ذرا کرکے تو دیکھو بہرحال استحضار دائم بالمعنی الاخیر(۶) چندروز اس لئے مطلوب ہے تاکہ اُس سے اصل مطلوب سہولت کے ساتھ حاصل ہوجائے باقی اصل مطلوب یہی ہے کہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے۔ اُس وقت اس کا استحضار کرلو اور اگر کوئی شخص ہمت کرکے اس پر قدرت حاصل کرلے ہر ناگوار واقعہ کے ساتھ ساتھ اس کو

(۱) شروع ہی سے پیدل چلنے اور منزل مقصود تک پہنچنے تک نہ رکنے کا ارادہ کرلیا ہے وہی ارادہ ہر قدم اٹھانے کے لئے کافی ہے (۲) سیر (۳) تاویل شدہ (۴) بغیر (۵) ناممکن (۶) آخری معنی کے اعتبار سے ہمیشہ اس کا پیش نظر رہنا۔

حاضر فی الذہن (۱) کرلیا کرے تو اُس کو استحضار دائم کی بھی ضرورت نہیں یہی کافی ہے کہ ضرورت کے وقت استحضار (۲) کرلیا کرے۔ پھر اس استحضار کے بعد ایک ناگوار واقعہ سے دوسرے ناگوار واقعہ تک اس کی برکات مستمر رہیں (۳) اور ثواب بھی دوام (۴) کا حاصل ہوگا کیونکہ اس کا یہی دوام ہے اور جب عمل دائم ہے تو اجر بھی دائم ہوگا۔

قلب کی نگہداشت

پھر اس میں یہ مت دیکھو کہ واقعہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ بلکہ ہر واقعہ میں استحضار کو لازم کرلو۔ اور واقعات دو قسم کے ہیں گوارا اور ناگوار۔ یہ مراقبہ جو اس وقت بیان کیا جارہا ہے ناگوار واقعات کے متعلق ہے اور گوارا واقعات کے متعلق دوسری تعلیم ہے یعنی شکر کی تعلیم۔ اُس کو میں اس وقت بیان نہیں کرتا۔ اُس کا بیان پھر کبھی ہوجائے گا (خدا کرے یاد رہے) سارے سبق ایک ہی دن میں پڑھا دیئے گئے تو اندیشہ ہے کہ پہلا سبق بھی نہ بھول جاؤ۔

اگر کوئی بچہ کئی سورتیں ایک دم سے حفظ کرتا ہے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک آیت ''الحمد'' کی یاد رہے گی۔ ایک قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی ایک قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی۔ حفظ کا طریقہ یہی ہے کہ ایک ایک سورت کو الگ الگ محفوظ کیا جائے۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لطائف ستہ (۵) کی مشق کو نافع نہیں فرمایا۔

(۱) ذہن میں حاضر کرلیا کرے (۲) پیش نظر (۳) مسلسل رہیں گی (۴) ہمیشگی (۵) لطائف چھ ہیں جن کے نام اور کام یہ ہیں: ۱ نفس۔ کام غفلت، ۲ قلب۔ کام ذکر، ۳ روح۔ کام حضور، ۴ سر۔ کام مکاشفہ ملکوت، ۵ خفی۔ کام مشاہدہ فنا، ۶ اخفی۔ کام معائنہ فناء الفنا۔ نفس بقیہ لطائف کے مضار ہے اور باقی لطائف آپس میں متناسب ہیں اور ہر ایک تحتانی رتبہ فوقانی کے لئے ممد ہے اور فوقانی تحتانی پر مشتمل ہے اس لئے فوقانی جاری ہونے سے تحتانی بھی جاری ہوجاتا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے رسالہ ''القطائف من اللطائف'' کا مطالعہ کریں شریعت وطریقت ص ۳۶۶۔

کیونکہ ایک لطیفہ کو ذاکر بناتا ہے تو دوسرا غیر ذاکر ہوجاتا ہے پھر دوسرے کو لیا تو پہلا غافل ہوجاتا ہے۔ اور ایک دم سے سب کو لیا گیا تو ہر ایک ناقص رہتا ہے پھر اس میں تشتت (۱) بھی ہے جو جمعیت کے منافی ہے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف لطیفۂ قلب کی نگہداشت کا امر فرمایا کرتے تھے اور یہی اوفق بالسنۃ (۲) ہے۔ حدیث وقرآن میں قلب کا ہی ذکر ہے باقی لطائف کا ذکر نہیں ہے۔ دوسرے اہل کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لطائف مثل مرایا متقابلہ (۳) کے ہیں جو چیز ایک میں مرتسم ہوتی (۴) ہے وہ بوجہ انعکاس کے سب میں مرتسم ہوجاتی ہے۔ اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قلب کو ذاکر بنالو بقیہ لطائف خود بخود ذاکر ہوجائیں گے ان کی مشق کی مستقل ضرورت نہیں ایک کے منور ہونے سے دوسرے بھی منور ہوجائیں گے۔ اس کی دلیل حدیث میں بھی ہے جو قلب کے باب میں ہے۔

اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ (جب وہ درست ہوجاتا ہے تو سارا بدن صحیح ہوجاتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح قلب سے تمام جسد کی اصلاح ہوجاتی ہے اور لطائف بھی جسد ہی (۵) سے متعلق ہیں جن کا اثر افعال جسد ہی پر پڑتا ہے۔

فائدہ

اور یہاں سے ایک مستقل فائدہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ لطائف ستہ کا وجود کشفی ہے اہلِ کشف کو یہ لطائف مکشوف ہوئے ہیں۔ نصوص میں ان کا کہیں ذکر نہیں نصوص میں صرف نفس وقلب کا ذکر ہے مگر بعض مدعیان تصوف نے صوفیہ کو بدنام کرنے کے لئے قرآن سے تمام لطائف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

(۱) پراگندگی وانتشار (۲) سنت کے موافق ہے (۳) ایک دوسرے کے مدمقابل شیشے ہوں (۴) جو ایک میں نظر آتی ہے عکس کی وجہ سے سب میں نظر آتی ہے (۵) جسم۔

چنانچہ ایک مدعی نے اِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی (۱) سے استدلال کرکے کہا ہے کہ لطائف کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور اس آیت میں کہا ہے کہ لطیفہ سر اور لطیفہ اخفیٰ مراد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تیرا سرِّ مراد ہے(۲) یہ تو ایسا استدلال ہے جیسا کہ ایک آج کل کے جاہل نے کہا ہے کہ ﴿عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾(۳) اور ﴿وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴾(۴) اس میں اشغال صوفیہ(۵) کا ذکر ہے کیونکہ ان کے یہاں مَقَامًا مَّحْمُوْدًا اور سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا بعض اشغال کا اصطلاحی لقب ہے۔ بھلا ان عقلمندوں سے کوئی پوچھے کہ قرآن کا نزول ان اصطلاحات کے بعد ہوا یا پہلے۔ یقیناً نزول قرآن اصطلاحات سے مقدم ہے۔ پھر قرآن میں ان کا ذکر کہاں سے ہوا کیونکہ ذکر تو اس طرح ہونا چاہئے کہ کلام کی دلالت ان پر ہوسکے اور جن آیات کا تم نے ذکر کیا ہے ان میں سوا اس کے کہ یہ الفاظ مذکور ہیں۔ ان اصطلاحات پر کسی طرح بھی دلالت نہیں۔

مرزا قادیانی کے استدلال کے مسکت جوابات

اور اگر استدلال کے لئے دلالت معنویہ کی ضرورت نہیں صرف الفاظ نص(۶) میں آجانا ہی کافی ہے تو ایسا استدلال ہوگا جیسا مرزا کا قول کہ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ (اور میرے بعد ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے ہیں جن کا نام مبارک احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا، میں انکی بشارت دینے والا ہوں) میں میری پیشین گوئی ہے۔ ایک شخص تھے مولوی نعیم انہوں نے

(۱)''بے شک وہ ظاہر و باطن کو خوب جانتے ہیں'' (۲) مطلب یہ ہے کہ یہ بات غلط ہے (۳)''اُمید ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا'' بنی اسرائیل: ۷۹ (۴)''اور مجھ کو چاہئے اس سے ایسا غلبہ کہ جس کے ساتھ نصرت ہو'' بنی اسرائیل: ۸۰ (۵) اشغال ان طریقوں کو کہتے ہیں جو صوفیاء نے دل جمعی کے لئے مقرر فرمائے ہیں مقصود بالذات نہیں ہیں (۶) صرف قرآن و حدیث میں اس لفظ کا موجود ہونا۔

اس کا خوب جوابدیا کہ مرزا کا نام تو احمد نہیں بلکہ غلام احمد ہے اور قرآن میں غلام احمد کا کہیں ذکر نہیں، ہاں میرا نام قرآن میں پورا موجود ہے۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (اس روزتم سے نعمتوں کی پوچھ گچھ ہوگی) اسی طرح ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مرزا سے بڑھ کر تو قرآن میں میری پیشین گوئی موجود ہے۔ میرا نام لقاء اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ''وہ لوگ خسارہ میں ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو جھٹلایا'' اور ایک مقام پر ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ''جوشخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہے (اسے پریشان نہ ہونا چاہئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وقت ضرور آنے والا ہے''۔ اگر یہی طریقہ استدلال کا ہے تو پھر کسی کا نام محمد رکھ کر دعویٰ کردو کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا ذکر ہے اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے۔ منطوق قرآن (۱) تو وہی بات ہوسکتی ہے جو قرآن کا مدلول صریح (۲) ہو یا قواعد عربیہ سے مفہوم ہو۔ اس کے بغیر کسی بات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔ جہالت محضہ ہے۔ بلکہ زندقہ ہے (۳)۔

مسائل تصوف کا ثبوت

اور مسائل تصوف کو ثابت کرنے کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے۔ کہ قرآن ہی میں اُن کا ذکر ہو۔ کیونکہ مسائل تصوف کی صحت کے لئے ان کا منطوق قرآن (۴) ہونا شرط نہیں بلکہ مسکوت عنہا ہونا، اور خلاف قواعد شرعیہ نہ ہونا کافی ہے۔ اس لئے معمولات اشغال صوفیہ کا قرآن میں ذکر ہونا ضروری نہیں۔ مگر

(۱) قرآن میں بولے گئے لفظ سے تو وہی بات مراد ہوسکتی ہے (۲) جس پر قرآن کے الفاظ طراحتاً دلالت کررہے ہوں یا عربی قواعد سے سمجھ میں آتے ہوں (۳) صریح جہالت اور الحاد ہے (۴) قرآن میں ان کے تذکرہ کی شرط نہیں ہے بلکہ اس بارے میں قرآن خاموش ہو اور یہ بات شرعی قواعد کے خلاف نہ ہو اتنا ہی کافی ہے۔

ہمارے حاجی صاحب نے جس لطیفہ کے اہتمام کی تاکید کی ہے وہ تو منطوق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث وقرآن میں اس کا ذکر صراحۃً ہے۔

لطیفۂ قلب

رہا یہ اشکال کہ حدیث میں تو مُضغہ (۱) کا ذکر ہے جو مادی ہے۔ اور لطیفہ قلب جس کی صوفیہ نے لطائف میں شمار کیا ہے۔ مجرد ہے مادی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں عین مضغہ مراد نہیں ورنہ مضغہ تو حیوانات میں بھی ہوتا ہے۔ بلکہ انسان سے بڑا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ شے مراد ہے جس کو اس مضغہ سے تعلق ہے اور وہ وہی ہے جس کو صوفیاء نے لطیفہ کہا ہے کیونکہ اس مضغہ میں اصلاح وصلاحیت وادراک مسائل کی قوت نہیں۔ اور قلب کے لئے فہم وعقل نصوص سے ثابت ہے معلوم ہوا کہ عین مضغہ مراد نہیں۔ بلکہ اُس کا متعلق مراد ہے۔ غرض حاجی صاحب نے لطائف کے اہتمام سے اسی لئے منع فرمایا ہے۔ کہ اس میں تشتت ہے (۲) اور ایک کے اہتمام سے دوسرا چھوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے اس وقت صرف ناگوار واقعات کے متعلق مراقبہ بتلایا ہے۔ گوارا واقعات کا ذکر نہیں کیا تاکہ یہ سبق نہ بھول جاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کہ گوارا واقعات میں تو شکر دل سے خود بخود نکلتا ہے۔ اس کے بیان کی زیادہ حاجت نہیں، خوشحالی اور راحت میں شکر سے۔ مانع اور مزاحم (۳) کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ حالت خود اس کو مقتضی ہوتی ہے۔ بخلاف تفویض (۴) کے جو ناگوار واقعات کا حق ہے۔ کہ پریشانی کے وقت تفویض کا از خود تقاضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں کشاکشی (۵) زیادہ ہوتی ہے۔ کہ تفویض کروں یا تجویز کروں یا کچھ نہ کروں۔ اس لئے اس کے ذکر کی زیادہ ضرورت تھی۔

(۱) صنوبری گوشت کا ٹکڑا (۲) انتشار (۳) شکر سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی (۴) سپردگی (۵) کھینچا تانی۔

غلبۂ تفویض

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ تمہارے بیان کے موافق تو تفویض کا حاصل (۱) یہ ہوا کہ نہ بچہ کو مارو نہ ملازم کو سزا دو۔ نہ بیوی کو کسی بات پر تنبیہ کرو کہ نمک تیز کر دیا بلکہ جو ناگوار بات پیش آئے یہ سمجھ لو کہ حضرت حق کا تصرف ہے (۲)۔ اور ہر حالت میں راضی رہو۔ میں کہتا ہوں کہ میری تقریر کا یہ خلاصہ ایسا نکالا گیا جیسے ''قَـنَّـوج'' (۳) میں ایک صاحب نے کہا تھا کہ ساری شریعت کا خلاصہ میں نے یہ نکالا ہے کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ غمی میں روؤ۔ نیز یہ خلاصہ ایسا ہوا۔ جیسے مولانا جامی کی حکایت مشہور ہے کہ ایک دفعہ سفر میں دستر خوان پر کھانا کم تھا تو رفیق سفر نے یہ چاہا کہ مولانا جامی کو باتوں میں لگا کر خود زیادہ کھا جائے تو اس نے مولانا سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے آپ نے کوئی کتاب یوسف علیہ السلام کے قصہ میں لکھی فرمایا: ہاں لکھی ہے کہا ذرا قصہ ہم کو بھی سنا دو۔ مولانا نے فرمایا:

پیرے بود پسرے داشت گم کرد بازیافت (۴)

بس یہ خلاصہ ہے ساری کتاب کا جو سو صفحہ سے زیادہ کی ہے ایسے ہی اس قنوجی نے شریعت کا خلاصہ نکالا کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ غمی میں روؤ۔

بعض لوگوں نے فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (۴)۔ سے یہ سمجھا ہے کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ضحک وبکاء دنیا مراد نہیں بلکہ فی الآخرۃ (آخرت میں) مقدر ہے اور فَلْيَضْحَكُوْا ''پس ہنسو'' امر بمعنی خبر ہے کہ آخرت میں یہ لوگ زیادہ روئیں گے جیسے ہمارے محاورہ میں

(۱) تفویض کا لب لباب وخلاصہ یہ ہوا (۲) اللہ کی طرف سے ہے (۳) جگہ کا نام ہے (۴) ''ایک بوڑھا شخص تھا اس کا ایک بچہ تھا جو گم ہو گیا تھا پھر مل گیا'' (۴) ''پس ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ''۔

بولا کرتے ہیں اب سر پکڑ کے روؤ یعنی اب رؤو گے یہ بھی خبر ہے امر بمعنی طلب نہیں اوراس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد جَـزَاءً بِـمَـا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ یہاں وہ ضحک قلیل و بکاء کثیر مراد ہے جو ان کے اعمال پر بطور جزاء کے مرتب ہوگا ضحک و بکاء دنیوی مراد نہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ دوسری نصوص بھی اس معنی کی نفی کررہی ہیں جو ان لوگوں نے اس آیت سے سمجھے ہیں کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ اپنی مجالس میں ہنستے تھے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ رات کو خلوت میں رویا کرتے تھے۔

كـانـوا ليوث الناهر ورهبان الليل ''دن میں ہنستے اور رات کو روتے''
نیز حضور ﷺ بھی ہنستے تھے مگر حضور ﷺ کی آواز ہنسی کے وقت نہ نکلتی تھی۔ صرف دندان مبارک نمایاں ہوجاتے تھے۔ كان جل ضحكة التبسم [۱] اوراس کا منشاء میرے خیال میں یہ ہے کہ حضور ﷺ پر غم کا غلبہ تھا۔

كـان متواصل الاحزان دائم الفكرة [۲] اور غلبۂ حزن میں کھل کر ہنسی نہیں آیا کرتی۔ بہر حال اول تو وہ خلاصہ جو اس قنوجی نے نکالا ہے غلط ہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ خلاصہ ہے تو حرج کیا ہوا کوئی یہ ثابت کردے کہ یہ خلاصہ قبیح ہے یقیناً کم ہنسنا اور زیادہ رونا قبیح نہیں بلکہ خدا پرستوں کی علامت ہی یہی ہے اور یہ جواب ایسا ہے جیسے کہ میں نے بعض نیچریوں کو جواب دیا تھا وہ کہتے تھے کہ مسئلہ ''وقف عـلـى الاولاد'' مسئلہ میراث سے بہتر ہے کیونکہ میراث میں جائیداد کا تیاپانچا ہوجاتا ہے۔ [۳] میں نے کہا کہ اگر شریعت کو یہی مقصود ہو تو کیا کرو گے [۴] تاکہ مسلمان مست مال نہ ہوجائے [۵]۔ تم نے مسئلہ میراث کا جو انجام بیان کیا ہے وہ تو مسلم ہے مگر یہ ثابت کرو کہ یہ انجام قبیح ہے اور اگر یہ

(۱) آپ کی انتہائی ہنسی تبسم تھا (۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر مند وغمگین رہتے (۳) مال کو تقسیم کرنا (۴) شریعت کو مال کا تقسیم کرنا ہی مقصود ہو (۵) مال کی محبت میں غرق نہ ہوجائے۔

انجام ہی شارع کو مقصود ہو تو پھر ''وقف علی الاولاد'' مسئلہ میراث سے کیونکر افضل ہوگا۔ یہی جواب میں اس قنوجی ملخص شروع(۱) کو دوں گا۔ بہرحال مسئلہ تفویض پر بظاہر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بس نہ ملازم پر تنبیہ ہو، نہ بیوی سے باز پرس ہو، نہ اولاد کو تادیب ہو(کیونکہ اپنے نفس کے لئے تادیب وانتقام ضروری نہیں۔ اور اگر یہ لوگ خدا ورسول کی مخالفت کریں تو اس پر رضا جائز ہی نہیں نہ اس پر سکوت کرنا تفویض کی ضد ہے۔ بلکہ وہاں تو تادیب ہی عین تفویض ہے)

تمکین اثر

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہاں جب غلبہ تفویض ہوگا تو اوّل اوّل حالت یہی ہوگی مگر تمکین کے بعد ہر حالت کے حقوق کو صحیح انداز سے ادا کرے گا۔ جیسے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت تھی کہ باوجود کامل صاحب تفویض ہونے کے سلطنت کا انتظام کرتے تھے اور ایسا انتظام کیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ تمکین کامل کا نتیجہ تھا اسی تمکین وثبات فی المواطن وادائے حقوق جمع المقامات کی بناء پر حضرات صحابہ فرماتے ہیں ''کان ابوبکر اشجع الناس بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم'' کہ ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ بہادر تھے۔ اور یہ منافی تفویض اس لئے نہیں کہ یہ سب من جانب اللہ مامور بہ یا ماذون فیہ ہیں(۲) تو امتثالاً للامر ان کو اختیار کرنا عین تفویض ہے(۳)۔

(۱) شریعت کا خلاصہ کرنے والے کو دوں گا (۲) اللہ کی طرف سے ان سب باتوں کا حکم ہے یا اجازت ہے (۳) حکم کی بجا آوری کے لئے ان کو اختیار کرنا ہی تفویض ہے۔

اشکال وجواب

اور حضرت صدیقؓ کے اشجع (۱) ہونے کے متعلق ایک مستقل اشکال اور جواب ہے۔ اس کو بھی تتمیما للفائدۃ (۲) ذکر کیئے دیتا ہوں۔ وہ اشکال یہ ہے کہ بادی النظر میں واقعات جنگ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ شجاعت میں زیادہ ہیں مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے اس کا جواب دیا ہے اور عمدہ جواب ہے کہ شجاعت دو ہیں ایک شجاعت امراء کی دوسری شجاعت فتیان کی اور اول اصعب ہے دوسروں سے کیونکہ ثانی کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے جان سے ہاتھ دھولیا(۳) کچھ بھی دشواری نہ رہی اور ثانی کا تعلق جمہور سے ہے وہاں جان سے ہاتھ دھونے سے کام نہیں چلتا۔ سو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت شجاعت امراء کی تھی اور حضرت علیؓ کی شجاعت فتیان تھی کہ یعنی سپاہی کی شجاعت تو یہ ہے کہ میدان میں دشمن کے مقابل قوی القلب (۴) رہے اور امراء سلاطین کی شجاعت یہ ہے کہ سخت خطرات وحوادث (۵) میں مستقل مزاج ہیں۔ پریشان واز جارفتہ نہ ہوں۔(۶) ہر حادثہ کی تدبیر مناسب کریں۔ واقعات شجاعت جو حضرت علیؓ کے زیادہ ہیں۔ وہ میدان حرب کے متعلق ہیں۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعات شجاعت میدان حرب کے متعلق زیادہ نہیں بلکہ انتظام حوادث وخطرات کے متعلق ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حضرت صدیق کے برابر قوی القلب صحابہ میں کوئی نہ تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں سب سے بہادر تھے

حضرت صدیق کی شجاعت وقوتِ قلب یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی

(۱) زیادہ بہادر ودلیر (۲) فائدہ کی تکمیل کے لئے (۳) جان دیدی کوئی پریشانی نہ ہوئی (۴) دل جمعی سے لڑے (۵) بہت سے حادثات اور پریشانی میں گھبرائے نہیں (۶) پریشان اور گھبرائیں نہیں۔

وفات کے وقت مستقل مزاج رہے خود بھی سنبھلے اور تمام صحابہ کو سنبھالا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت محمد ﷺ کی وفات کی خبر مشہور ہوئی اور تمام اطراف سے شورش برپا ہوئی مسلمان نرغہ میں آ گئے۔ قبائل عرب مرتد ہونے لگے مخالف سلطنتوں نے پیش قدمی کا ارادہ کیا اس وقت تمام صحابہ گھبرا گئے مگر حضرت صدیق کے قلب کو تزلزل نہیں ہوا۔ چنانچہ خلافت پر متمکن ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔ حالانکہ اس نرغہ کی حالت میں بظاہر اس کی ضرورت تھی کہ مدینہ میں لشکر رکھا جاتا کیونکہ ایسی حالت میں پائے تخت کو لشکر سے خالی کرنا خطرہ سے خالی نہیں مگر حضرت صدیق ؓ نے فرمایا کہ جیش اسامہ کے بھیجنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود انتظام فرما چکے تھے روانگی کا حکم دے چکے تھے اور اسامہ کے لئے جھنڈا خود باندھ چکے تھے۔ تو جس جھنڈے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہو میں اُس کو نہیں کھول سکتا چاہے مدینے والے زندہ رہیں یا فنا ہو جائیں یہ لشکر جائے گا اور ضرور جائے گا چنانچہ یہ لشکر روانہ ہوا اور خدا تعالیٰ نے اس کی روانگی سے دشمنوں کے دل پر رُعب طاری کر دیا اور وہ سمجھ گئے کہ مسلمانوں میں اُن کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ضعف نہیں آیا بلکہ وہ بدستور اُسی قوت کے ساتھ دشمنوں کی سرکوبی کو موجود ہیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اور وہی نظام قائم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھا۔ اس کے بعد حضرت صدیقؓ نے مرتدین کی سرکوبی کی طرف توجہ کی اور ایک لشکر اس کام کے لئے روانہ کیا۔ اس معاملہ میں حضرت عمر بھی گھبرا گئے تھے۔ مگر حضرت صدیق نہیں گھبرائے اور نہایت استقلال سے ایک سال میں تمام اہل عرب کو اسلام پر پختہ کر دیا جو ضعیف الاسلام مرتد ہو گئے تھے ان کو تہہ تیغ کیا یا اُنہوں نے توبہ کر کے اسلام کی طرف رجوع کیا، یہاں تک کہ جزیرہ عرب تمام فتنوں سے پاک ہو گیا۔

اور دوسرے سال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مخالف سلطنتوں کی طرف نہایت اطمینان سے ازخود پیش قدمی کی۔ کسی مخالف کو اپنی طرف پیش قدمی کرنے یا بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ محقق اہل سیر کا قول ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے دو سال میں وہ اصول سلطنت ممہد (۱) کئے تھے جن پر عمل کر کے حضرت عمر نے دس سال میں وہ انتظامات کئے اور وہ فتوحات کثیرہ حاصل کیں جن کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ عام طور پر لوگ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو فاتح اعظم سمجھتے ہیں مگر محققین حضرت صدیق کو فاتح اعظم کہتے ہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فتوحات کا راستہ ہموار کیا ایک نقشہ قائم کر دیا اور یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اسی راستہ پر اسی نقشہ کے مطابق چلتے رہے جس سے یہ فتوحات حاصل ہوئی یہ جواب ہو گیا اس اشکال کا۔

توسط واعتدال

اب مقصود کی طرف عود کرتا ہوں (۲) کہ یہ شجاعت صدیق رضی اللہ عنہ تمکین (۳) کا اثر ہے تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اسی تمکین کا نام توسط ہے اسی توسط کی وجہ سے اس امت کا لقب ''امۃ وَسَطَ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۴) ''اور اسی طرح تمہیں صاحب اعتدال امت بنایا'' وسط بتحریک الاوسط کے معنی ہیں۔ معتدل کیونکہ وَسَطَ وہ ہے جو بالکل درمیان میں ہو۔ اور وسط بسکون الاوسط عام ہے۔ (۵) مطلق مابین الطرفین کو اسی لئے اہل لغت کے یہاں اس کے متعلق ایک لطیفہ ہے

---

(۱) ایسے اصول وضع کئے (۲) لوٹتا ہوں (۳) طاقت (۴) سورۃ البقرۃ: ۱۴۳ (۵) ''وسط'' اس لفظ میں دو لغت ہیں ایک پر زبر پڑھیں یعنی ''وَسَـطَ'' تو عین درمیان مراد ہوگا اور اگر سین پر سکون پڑھیں تو دونوں جانبوں کا درمیان مراد ہوگا۔

الساکن متحرک والمتحرک الساکن کہ(۱) وسط بالسکون تو متحرک ہے یعنی متعین نہیں اور وسط بالتحریک ساکن ہے یعنی متعین ہے اور وسط حقیقی تمام مراتب کے اعتبار سے مرتبہ اعتدال کا ہوگا۔ پس وسط کی حقیقت معتدل ہوئی اور تمکین اسی اعتدال کا نام ہے۔ استقیموا ولن تحصوا میں اسی اعتدال کا امر ہے اوراس اعتدال کی حقیقت حکماء نے یہ بیان کی ہے کہ تمام قویٰ کا مرجع دوقوتیں ہیں ایک علمیہ یعنی نافع وضار کا سمجھنا(۲)۔ دوسری عملیہ یعنی نافع کو حاصل کرنا اور ضار کو دفع کرنا (۳) تو عملیہ دو قسم ہوئیں سوکل تین قسمیں ہوئیں اول کا نام قوۃ عقلیہ ہے دوسری کا نام شہوت تیسری کا نام غضب پھران تینوں میں تین تین درجے ہیں ایک افراط ایک تفریط(۴) ایک توسط واعتدال چنانچہ قوتِ غضب کے تین درجے ہیں ایک تَہوُّد(۵) یہ افراط ہے۔ایک جبن(۶) یہ تفریط ہے۔ایک شجاعت یہ اعتدال ہے اسی طرح قوت شہوت کے تین درجے ایک شبق وفجور(۷) یہ افراط ہے۔ایک عنت(۸) یہ تفریط ہے ایک عفت(۹) یہ اعتدال ہے اسی طرح قوت عقلیہ کے تین درجے ایک جزبرہ(۹) یہ افراط ہے ایک سفہ(۱۰) یہ تفریط ہے ایک حکمت(۱۱)۔ یہ اعتدال ہے پس ان تینوں کے توسط کا مجموع عدل ہے(۱۲)۔جس کو یہ عدل حاصل ہوجائے وہ صاحب تمکین(۱۳) ہوتا ہے تو صاحب تمکین کو ہر

(۱) جب ساکن پڑھیں تو عین درمیان نہیں بلکہ مطلق درمیان مراد ہے اور اگر متحرک پڑھیں تو بالکل بیچوں بیچ مراد ہوگا (۲) فائدہ مند اور اللہ کے پسندیدہ کو سمجھنا (۳) فائدہ مند کو حاصل کرنا نقصان دہ سے بچنا (۴) ایک کمی کا ایک زیادتی کا (۵) بالکل بھیڑیا ہی بن جائے اس کو تہور کہتے ہیں (۶) جوتے مارلے دین کو برا کہے تبھی غصہ نہ آئے کوئی بے حس بن جائے اسکو جبن کہتے ہیں (۷) حلال وحرام کی بھی تمیز نہ رہے زنا میں مبتلا اس کو شبق وفجور کہتے ہیں (۸) ایسا پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرے (۹) پاکدامنی (۱۰) اپنی کو اتنا بڑھائے کہ وحی کا بھی انکار کردے (۱) جہل بے وقوفی (۱۲) دانائی (۱۳) میانہ روی (۱۴) زور آور اور بلند مرتبہ ہوتا ہے۔

قوت میں اعتدال حاصل ہوجاتا ہے۔

صاحبِ تمکین

اسی لئے صاحب تمکین غالب علی الاحوال (۱) ہوتا ہے کیونکہ اعتدال کی وجہ سے کوئی حالت اس پر غالب نہیں ہوتی غلبہ حالت اُس وقت ہوگا جب کہ کوئی حالت حدافراد (۲) میں پہنچ کر اعتدال سے نکل گئی ہو۔ اور اسی لئے ابوالوقت (۳) کو کوئی نہیں پہچانتا کیونکہ اُس پر جوش وخروش وغیرہ کا غلبہ نہیں ہوتا بلکہ سکون غالب ہوتا ہے کیونکہ اعتدال کا خاصہ سکون ہے اور ابن الوقت (۴) کو سب پہچان لیتے ہیں کیونکہ وہ غلبۂ حال کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات دوسروں سے جُدا ہوتی ہیں۔ غلبہ مواجید سے دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام (۵)

مولانا رشید احمد گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کا مقامِ بلند

میں نے اپنے بزرگوں میں سے بحمد اللہ بہت حضرات کی زیارت کی ہے مگر سب سے زیادہ حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کو ابوالوقت دیکھا ہے۔ میں بچپن میں مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کو متقی تو سمجھتا تھا لیکن صاحب مقامات نہیں جانتا تھا مگر جب مولانا کی اوّل زیارت مجھے دیوبند میں نصیب ہوئی تو صورت دیکھتے ہی ایک خاص کشش مولانا کی طرف ہوئی، اور ایسی زبردست کشش ہوئی کہ میں مولانا کی

---

(۱) احوال پر غالب ہوتا ہے (۲) حد سے متجاوز ہوکر (۳) وہ سالک جو اپنے حال پر غالب ہو یعنی جس کی کیفیت وحالت کو چاہے اپنے اوپر طاری کرلے (۴) وہ سالک جو مغلوب الحال ہو یعنی جو حالت اس پر طاری ہو اس کے آثار میں مغلوب ہوجائے (۵) ''ناقص آدمی کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے زیادہ باتیں نہ بناؤ بس تم پر سلام ہے''۔

طرف دوڑا، دوڑتے ہوئے ایک اینٹ پر پیر رکھا گیا وہ اینٹ ہل گئی میرا پیر اس پر سے اُکھڑا اور میں گرنے لگا تو حضرت مولانا نے مڑکر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سنبھالا، بس اس اَدا سے میرے اندر مولانا کے ساتھ عشق کی شان پیدا ہوگئی اور اعتقاد کامل اسی وقت سے پیدا ہوگیا جو بحمداللہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہا۔ مولانا ابوالوقت تھے حالت پر غالب تھے مغلوب نہ تھے اس لئے بہت کم لوگوں نے مولانا کو پہنچانا۔ اکثر علماء مولانا سے مسائل فقہیہ پوچھا کرتے تھے (جو دوسری جگہ سے بھی معلوم ہوسکتے تھے) مولانا کا جو خاص کمال تھا اس کو علماء میں سے بھی بہت کم لوگوں نے پہچانا کیونکہ کام کرنے والے کم تھے اور اس کمال کی خبر کام کرنے والے کو ہوتی ہے۔ مسائل ظاہرہ کی تحقیق کرنے والے کو نہیں ہوتی۔ کام کرنے کے بعد جو مولانا سے چند سوالات کیئے گئے اور مولانا کے جوابات سنے تو اس وقت معلوم ہوا کہ عجیب شان کے اور بڑے دَرجے کے بُزرگ ہیں اور بزرگی کے ساتھ بڑے درجہ کے محقق بھی ہیں۔ مولانا کی شان یہ تھی کہ آپ سے ایک پردیسی بی بی بیعت ہوئی تھی مولانا نے اُسے اپنے گھر جا کر بیعت فرمالیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی نہایت بے قراری کی اطلاع کرکے درخواست کی کہ اب میں جارہی ہوں۔ ایک بار زیارت کی اور تمنا ہے۔ مولانا نے صاف فرمایا کہ مجھے فرصت نہیں۔ یہ ابوالوقت کی شان ہے ظاہر میں یہ جواب بے رحمی کا تھا مگر حقیقت میں یہ عین رحمت تھی۔ تاکہ قلق جلد قطع ہوجائے۔ کوئی ابن الوقت [1] ہوتا تو غلبۂ رحمت سے فوراً جاکر اپنی زیارت کرادیتا تاکہ ایک مسلمان کا جی بُرا نہ ہو۔ مگر مولانا نے اس پہلو کے ساتھ دوسرے پہلو پر بھی نظر فرمائی کہ اس وقت اس پر جدائی کا قلق غالب ہے پھر نامعلوم اس کے رنج وغم میں وہ کہیں سامنے آجائے تو پیروں میں گر پڑے یا کیا کرے اس لئے صاف فرمادیا کہ مجھے فرصت نہیں اور ذرا اس کی فرمائش سے متاثر نہیں

(۱) مغلوب الحال سالک۔

ہوئے۔ حضرت بڑے کوہ وقار[۱] تھے۔آپ کے یہاں مجلس میں بعض لوگوں پر وجدوحال بہت غالب ہوتا۔ بہت لوگ چلاتے تھے مگر مولانا میں کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ظاہر میں ساکن معلوم ہوتے تھے مگر باطن میں رگ رگ میں اثر تھا۔ باطن میں ہر حال سے پورے متاثر تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے اہل حال پر اعتراض کردیا کہ حضرت اب تو آپ کے یہاں ذکر میں تالیاں بجائی جاتی ہیں۔ مولانا کو جوش آ گیا اور فرمایا بس خاموش رہو تم کیا جانو! اور اس کے بعد اہل حال کی طرف سے دلائل بیان کرنا شروع فرمائے۔ جس سے اُن کی تائید وحمایت مترشح ہوتی تھی۔[۲]

معترض تو ان دلائل کو سن کر دم بخود رہ گئے۔ کہ یہ کیا ہونے لگا ہم تو مولانا کو وجد وغیرہ کا منکر سمجھتے تھے۔ یہ تو حامی اور طرف دار ہو گئے۔ مگر حقیقت میں مولانا محقق تھے۔ نہ منکر تھے نہ طرف دار تھے یعنی ہر چیز کو اس کی حد پر رکھتے تھے۔ جس درجہ میں وجد جائز ہے اس درجہ کا انکار نہ تھا اور جس درجہ میں حرام تھا اس کی تائید نہ تھی چونکہ اس ذاکر کا غلبہ حال میں تالیاں بجانا بوجہ بے اختیاری کے حد جواز میں تھا اس لئے اس کی تائید فرمادی اور قوالی والوں کا سماع حدِ جواز سے نکلا ہوا ہے اس کی مخالفت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نظیر ہندوستان میں تو ہم نے نہیں دیکھی باقی ممالک کی ہم نے سیر نہیں کی اس لئے ان کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جاسکتا مگر افسوس مولانا کو بہت کم لوگوں نے پہچانا۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ تفویض کا ابتداء میں جب غلبہ ہوتا ہے تو اس وقت بے شک یہی اثر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص کسی سے نہ مؤاخذہ کرتا ہے نہ کسی کو تنبیہ کرتا ہے لیکن تمکین[۳] کے بعد تمام

(۱) وقار کا پہاڑ تھے (۲) تائید اور حمایت معلوم ہو رہی تھی (۳) دوام طاعت اور کثرت ذکر میں استقامت سے مشغول رہتے ہیں حسب استعداد آخر میں مناسب حالت محمودہ پر قرار ہوتا ہے جس کو اصطلاح تصوف میں تمکین کہتے ہیں تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے ہیں اسی تمکین کا نام توسط واعتدال ہے۔ (طریقت وشریعت ص۳۵۲)۔

احوال کے حقوق کو ادا کرتا ہے۔ تمکین کے اوپر یہ گفتگو طویل ہوگئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس مراقبہ کو ہر دم مستحضر رکھنا چاہئے کہ عالم میں جو تصرف ہوتا ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم کو تصرف حق پر راضی رہنا چاہئے۔ اگر ہر دم استحضار نہ ہو سکے تو کم از کم جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے اس وقت تو ان مقدمات کو مستحضر کرلیا جائے کہ یہ تصرف حق ہے اور تصرف حق پر مجھ کو راضی رہنا چاہئے یہ بھی ایک قسم کا دوام ہے۔ یہ تھا مقصود جو میں آج بیان کرنا چاہتا تھا۔

خلق وامر کی تفسیر

اب اس پر اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ''جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا'' سے دلالت کی وجہ بتلانا چاہتا ہوں۔ اس میں ''الا'' تو تنبیہ کے لئے ہے اور ''لہٗ'' کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ تقدیم ما حقہ التاخیر حصر کو مفید ہے(۱)۔ اور ''خلق'' اور ''امر'' کی تفسیر لغتی ظاہر ہے خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا، حاصل یہ ہوا کہ تکوین وتشریح دونوں قسم کے تصرفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں پس ہر قسم کے تصرفات اُنہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ تو لغت کے اعتبار سے خلق وامر کی تفسیر ہے اور جو ظاہر بھی ہے اور صحیح بھی مگر بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کو قرآن میں ٹھونستے ہیں۔ یہ بڑی جہالت ہے چنانچہ صوفیاء کی ایک اصطلاح ہے عالم مادی کو عالم خلق کہتے ہیں اور مجردات کو عالم امر (۲) جس کی تفصیل یہ ہے تجرد عالم کے

---

(۱) جس کو بعد میں ذکر کرنا تھا اس کو پہلے ذکر کیا جائے تو اس سے حصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات ذی مادہ وذی مقدار پیدا کی ہیں ان کو مادیات کہتے ہیں تمام اجسام علویہ وسفلیہ ایسے ہی ہیں اور بعض مخلوقات مادہ اور مقدار سے مجرد (خالی) پیدا کی گئی ہیں ان کو مجردات کہتے ہیں۔ اور ارواح انسانیہ اور دیگر لطائف قلب وسر وخفی واخفی ایسے ہی ہیں اور یہی مراد ہے صوفیاء کے اس قول سے کہ لطائف فوق العرش میں مادیات کو عالم خلق اور مجردات کو عالم امر کہتے ہیں۔ حضرت تھانوی اسی بحث کو تفصیل سے بیان کررہے ہیں یہ صوفیاء کے کام کی باتیں ہیں عوام کے لئے مذکورہ تفصیل سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

بارے میں تین مذاہب ہیں متکلمین کے یہاں تو اشیاء عالم میں مجرد کوئی نہیں۔ سب مادی ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور زیادہ مادی ہیں مگر مجردات کو قدیم مانتے ہیں، تیسرا مذہب صوفیاء کا ہے کہ عالم میں بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور مادی بھی مگر سب حادث ہیں کوئی مجرد قدیم نہیں، متکلمین نے نفی تجرد پر یہ استدلال کیا ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے حکماء وصوفیاء نے اس مقدمہ کو رَد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قول میں خود مصادرہ علی المطلوب ہے کہ چونکہ تم کسی کو مجرد نہیں مانتے اس لئے تجرد کو اخص صفات سے کہتے ہو۔ ورنہ اس مقدمہ کی کوئی دلیل نہیں صوفیاء وحکماء کہتے ہیں کہ اخص صفات باری سے وجود بالذات ہے۔ واجب بالذات حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اور مجرد عن المادہ مخلوقات میں بھی ہیں مگر صوفیا اور فلاسفہ میں فرق یہ ہے کہ صوفیا مجردات کو حادث مانتے ہیں اور فلاسفہ قدیم کہتے ہیں۔ بہرحال صوفیا کا مذہب یہ ہے کہ بعض اجزاء عالم مجرد عنا لمادہ ہیں چنانچہ روح کو وہ مجرد کہتے ہیں اور اس کے علاوہ انسان میں بعض لطیفے ان کو اور مکشوف ہوئے اور ان کے نزدیک حقیقت انسان ان مجردات اور جسد مادی سے مرکب ہے ان لطائف کو بھی صوفیہ نے مجرد کہا ہے اور یہ ان کو کشف صحیح سے معلوم ہوا ہے۔ بجز کشف کے اس کی اور کوئی دلیل نہیں۔ مگر ان میں نفس مادی ہے۔ بمعنی حال فی المادہ اس کو لطائف میں تغلیباً شمار کرلیا ہے نیز صوفیاء نے فرمایا ہے کہ ان کا مقام فوق العرش ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ فوق العرش ان کا جز ہے تاکہ مجرد کے لئے مکان وحیز لازم آئے بلکہ فوق العرش سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی مکان نہیں توجیہ اس ارادہ کی یہ ہے کہ عرش منتہی ہے۔ امکنہ (۱) کا اور فوق کے لئے خارج ہونا لازم ہے۔ پس فوق العرش کے معنی یہ ہوئے خارج عن الامکنہ، باقی رہی یہ تحقیق

(۱) تمام مخلوقات کی انتہاء عرش پر ہو جاتی ہے۔

کہ وراء العرش مکان تو نہیں لیکن پھر کیا ہے آیا خلاء ہے یا خلاء بھی نہیں تو دونوں امر ممکن ہیں لیکن حکماء نے بلا دلیل دعویٰ کیا ہے کہ محدود جہات کے اُدھر نہ خلاء ہے نہ ملا۔

خلاء تو اس لئے نہیں کہ محال ہے (اور یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے) اور ملا اس لئے نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ عجیب دلیل ہے کہ جس چیز کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ معدوم محض ہے۔ یہ حال ہے ان کے دلائل کا جو مضحکہ خیز ہیں۔ غرض صوفیا نے عالم کی تقسیم مجردات و مادیات کی طرف کر کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ مجردات کو عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اور مادیات کو عالم خلق کہتے ہیں سو اول تو یہ ایک اصطلاح ہے "ولا مشاحته فی الاصطلاح" لیکن اس تسمیہ میں ایک مناسبت بھی ہے وہ یہ کہ خلق کے معنی لغت میں مادہ میں صورت پیدا کرنا اور اس کے مقابل ہے ابداع یعنی خود مادہ کو پیدا کرنا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے" چنانچہ اس کے متصل ہی "وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قضاء محض کن ہے اس میں مادہ کا توسط نہیں اور اللہ تعالیٰ تو مادہ کے بھی خالق ہیں اور صورت و ہیئت کے بھی باقی مادہ میں صورت بنانا یہ ایک درجہ میں بندہ سے بھی ممکن ہے چنانچہ رات دن ایجادات میں یہی ہوتا ہے کہ مادہ کے اندر نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ مگر مادہ کا خالق سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اسی واسطے قرآن میں "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ" فرمایا ہے۔ احسن المبدعین نہیں فرمایا کیونکہ مبدع بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ بہرحال مادیات کو عالم خلق اس لئے کہا کہ ان کا وجود مادہ اور صورت کے ملانے سے ہوا ہے ان میں مادہ اور صورت کی ترکیب ہوتی رہتی ہے۔ اور مجردات کو عالم امر اس لئے کہا کہ وہاں مادہ

وصورت کی ترکیب نہیں ان کا وجود صرف کلمہ کن سے ہوا ہے جو کہ محض ایک حکم ہے یہ تو اس اصطلاح کی حقیقت اور وجہ تسمیہ کا بیان تھا۔

امر کی غلط تفسیر

اور میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ صوفیاء کی اس تحقیق کا منشاء محض کشف ہے کسی نص سے (۱) اس تقسیم کا دعویٰ نہیں کیا مگر اب لوگوں نے یہ غلو کیا ہے کہ اصطلاح کو قرآن میں ٹھونسا ہے یعنی اس آیت کو اصطلاح پر محمول کر کے "الا لہ الخلق والامر" (خبردار اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی تفسیر عالم خلق وعالم امر سے کی ہے اور قرآن سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرنے لگے۔ یہ غلو اور تحریف ہے پھر بناء الفاسد علی الفاسد کے طور پر اس آیت میں امر کی تفسیر عالمِ امر سے کر کے دوسری آیت "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" سے متکلمین پر رد کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ تو روح کو عالم امر (مجردات) سے بتلاتے ہیں اور تم اس کو عالم خلق (مادیات) سے کہتے ہو یہ الزام بھی فاسد ہے کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں کہ "من امر ربی" سے عالمِ امر مراد ہے۔

روح کے متعلق بحث

باقی متکلمین نے جو روح کو مادی کہا ان کو شبہ ان احادیث سے ہوا جن میں یہ مضمون وارد ہے کہ نسمۂ مؤمن شہید کا طیر خضر کے حواصل میں شجرہ جنت میں معلق رہتا ہے (۲) اور کھاتا پیتا اور جنت میں اڑتا پھرتا ہے اور بعض احادیث میں روح اور نفس کے عنوان سے اس کا حرکت کرنا عروج ونقل کرنا وارد ہے اور یہ سب اوصاف مادی کی صفات ہیں، صوفیاء نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہاں وہ روح

(۱) قرآن وحدیث سے (۲) مسلمان شہید کی روح جنت کے درخت پر سبز پرندہ کے اندر رہتی ہے۔

مجرد مراد نہیں بلکہ نسمہ اور روح یا نفس اس کے علاوہ اور چیز ہے جو اس روح مجرد کا مرکب ہے اور وہ ایک جسم لطیف ساری فی البدن اور بالکل ہیئت بدن پر ہے اور اس کا تعلق اس جسدِ عنصری کے ساتھ ایسا ہے جیسا تعلق جسم تعلیمی کو جسم طبعی کے ساتھ ہے کہ مقدار اور ہیئت میں بالکل جسم طبعی پر منطبق ہے پس جس طرح جسم تعلیمی جسم طبعی میں ساری ہے یونہی وہ نسمہ جسد عنصری میں ساری ہے متکلمین کی نظر اس نسمہ تک ہی گئی اور وہ اسی کو روح کہتے ہیں اور ایک تیسری روح اور ہے جس کو روح طبعی کہتے ہیں وہ ایک لطیف بخار ہے جو ہر دم اور جو ہر منی سے پیدا ہوتا ہے یہی بخار لطیف تمام بدن میں سرایت کر کے بدن کی طبعی تدبیر کرتا ہے اور اطباء اسی سے بحث کرتے ہیں۔ اور اُن میں جو مسلم اور محقق ہیں وہ روح حقیقی مجرد اور نسمہ کے منکر نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہماری بحث کا تعلق اس سے نہیں ہے کیونکہ یہ روح حقیقی یا نسمہ سے صحت و مرض کا کوئی تعلق نہیں اس کا تعلق اسی بخار لطیف سے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک روح تو بخار لطیف ہے اور دوسری روح نسمہ ہے جو بواسطہ بخار لطیف کے جسد میں ساری ہے اور دونوں مادی ہیں، تیسری روح اصلی اور حقیقی روح ہے جس کے لئے نسمہ مرکب ہے وہ مجرد ہے۔ زیادہ تفصیل کا شوق ہو تو میرا رسالہ ”الفتوح فیما یتعلق بالروح“ مطالعہ کیا جائے۔ غرض ”قل الروح من امر ربی“ سے تجرد روح پر استدلال کرنا بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ کیونکہ یہاں عالم امر اصطلاحی مراد نہیں۔ رہا یہ کہ پھر کیا مراد ہے تو ہم کہتے ہیں کہ امر کے لغوی معنی مراد ہیں کہ روح خدا کے حکم سے پیدا ہوئی۔ رہا یہ کہ اس کے بیان سے کیا فائدہ ہے تو سائل کو بھی معلوم تھا کہ روح بھی اور روح کے سوا تمام مخلوقات بھی خدا کے حکم سے پیدا ہوئی ہیں۔ (کیونکہ سائل اہل کتاب تھے جو خدا تعالیٰ کی خالقیت

کے منکر نہ تھے) سو فائدہ اس جواب کا یہ ہے کہ مخاطب کو یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے بس اتنا ہی سمجھ لو کہ وہ خدا کے حکم سے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم اس سے زائد نہیں سمجھ سکتے کیونکہ حقیقت روح فوق الفہم (۱) ہے اور اس کے بعد ''وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً'' (اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے پس ''الا لہ الخلق والامر'' (یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی یہ تفسیر تو غلط ہے جو اصطلاح سے کی گئی ہے۔

آیت کی تفسیر

رہا یہ سوال کہ پھر کیا معنی ہیں سو اس کے جواب کے لئے ہم کو کسی دوسری جگہ جانا نہیں پڑتا۔ بلکہ اسی آیت کے سباق سے خلق و امر کے معنی کی تعیین ہو جائے گی حق تعالیٰ نے اس سے پہلے فرمایا ہے: ''اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض'' (بیشک تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اس میں خلق بمعنی الایجاد کا ذکر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں یہاں کسی نے خلق بمعنی عالم خلق اصطلاحی نہیں لیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے: ''وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ م بِاَمْرِہ'' (اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں)

یہاں امر سے بالاتفاق حکم مراد ہے پس یہی معنی ''اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' میں مراد ہیں کہ ایجاد و حکم اللہ کے لئے خاص ہے جس کو دوسرے عنوان سے یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ تکوین و تشریع خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور ہر چند کہ حکم عام ہے تکوین و تشریح کو۔ لیکن تکوین کی حقیقت خود خلق ہے اور یہاں امر اور خلق کو متقابل ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ قرینہ ہے اس کا کہ امر سے مراد امر تکوین نہیں بلکہ تشریعی

(۱) سمجھ میں نہیں آسکتی۔

ہے یہاں تک الحمد للہ "الا لـہ الخلق والامر " (یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی تفسیر تو واضح ہوگئی۔

علمی اشکال

اب میں تتمیم فائدہ کے لئے اس کے بعد کی آیات کی بھی تفسیر کرتا ہوں کیونکہ ان کو اس مضمون کی تتمیم (۱) میں دخل ہے اور اس سے پہلے ایک شبہ کو جو کلام سابق کے متعلق ہے رفع کرتا ہوں جو کہ خلق پر وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو معدوم کو موجود کرتے ہیں تو اس کی صورت دوسری آیات میں یہ وارد ہے کہ "کن" کہہ دیا اور موجود ہوگیا تو کن میں خطاب کس کو ہے کیا معدوم کو امر ہے میرے پاس ابھی ایک خط آیا تھا جس میں یہ سوال تھا کہ کن کس کو کہا جاتا ہے میں نے اس کو تو یہ جواب لکھ دیا کہ ؎

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ برنیا بدہ کوہ رایک برگ کاہ (۲)

یعنی سوال اپنی حیثیت کے موافق کرنا چاہئے یہ سوال تمہاری قابلیت سے زیادہ ہے، مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سوال لاجواب ہے۔ لاجواب نہیں، بلکہ اگر آپ اپنی قابلیت کے بعد ہم سے کہیں کہ لاجواب (لا امر کا صیغہ یعنی پیش کر اس میں صنعت کی رعایت ہے) تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ موجودہ علمی کو یہ خطاب کیا گیا ہے کہ موجود خارجی ہوجا۔ یعنی جو شئی خارج میں معدوم ہے وہ معدوم محض نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے پس ایجاد تو معدوم کا ہے۔ اور خطاب اس شئے کو ہے جو موجود ہے اور اس جواب کی ضرورت ایجاد اول میں ہے اور ایجاد ثانی یعنی قیامت کے بعد ونشر میں تو خطاب ایسی شئے کو ہے جو موجود خارجی بھی

(۱) تکمیل (۲) جو کچھ مانگو اندازہ سے مانگو۔ اُکھاڑ نہیں سکتا پہاڑ کو ایک پتہ گھاس کا۔

ہے اور علمی بھی۔ کیونکہ قیامت میں جو عالم معدوم ہوگا تو وہ عدم محض نہ ہوگا۔ بلکہ عدم خاص ہوگا کہ صورت عالم فنا ہوجائے گی۔ مادہ باقی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عدم محض محال عقلی ہے۔ ہرگز نہیں عدم محض بھی حق تعالیٰ کی قدرت سے خارج نہیں وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ صورت و مادہ دونوں کو فنا کردیں پھر ایجاد کردیں جیسا ایجاد اول میں ہوا۔ مگر عادۃ اللہ یوں ہی واقع ہے کہ ایجاد اول کے بعد وہ موجود کو معدوم محض نہیں کرتے۔ یہ عادت نصوص سے معلوم ہوئی کہ قیامت میں جو عالم فنا ہوگا وہ فنائے صورت ہے۔ فناء محض نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ہے۔

''اِنَّ الْاِنْسَانَ یَفْنِیْ وَلَا یَبْقٰی مِنْهُ شَیْءٌ اِلَّا عُجْبُ الذَّنْبِ'' کہ انسان کے کل اجزا فناء ہوجائیں گے مگر ریڑھ کی ہڈی فنا نہ ہوگی۔ قیامت میں اسی ہڈی سے انسان کا تمام جسم بن جائے گا۔ جیسا کہ گٹھلی سے درخت پیدا ہوجاتا ہے گویا یہ جزو بمنزلہ تخم کے ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب انسان کو جلادیا جاوے گا جیسا کہ بعض اقوام مردہ کو جلاتے ہیں۔ تو اس وقت تو ہڈی بھی راکھ ہوجاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسلم نہیں کہ سب ہڈیاں راکھ ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ مرگھٹوں میں ہڈیاں دستیاب ہوتی ہیں اور مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ ہڈیوں کی راکھ میں جو جزو ریڑھ کی ہڈی کا ہے وہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ محسوس بھی نہ ہوتا ہو۔ جیسا کہ جزو لایتجزی سو حدیث تو یہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت یا قیامت سے فناء محض نہ ہوگا، دوسری ایک آیت یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح سب کی زندہ رہیں گی۔ ہاں نفخ صور سے ارواح بے ہوش ہوجائیں گی چنانچہ نص میں ہے۔ ''وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی

السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ"۔ اور صعق کے معنی غشی اور بے ہوشی کے ہیں گو فناء بھی مراد ہوسکتا ہے۔ مگر متبادر معنی اول ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ نفخات تین ہوں گے ایک سے ارواح بے ہوش ہوجائیں گے اور دوسری سے تمام عالم مع ارواح کے فنا ہوجائے گا تیسری سے سب زندہ اور موجود ہوجائیں گے تو یہ دعویٰ بلا دلیل اور بلاضرورت ہے۔ بلا دلیل تو اس لئے کہ نصوص سے صرف دو نفخہ معلوم ہوتے ہیں تین نہیں معلوم ہوتے اور بلاضرورت اس لئے ہے کہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ نفخہ اولیٰ سے جو فنا ہوگا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اجسام فنا ہوجائیں گے اور ارواح بے ہوش ہوجائیں گی پس فنا اجسام کے لئے ہے اور صعق ارواح کے لئے ہے اسی تقریر سے نصوص کا تعارض مرتفع ہوسکتا ہے پھر نفخات ثلث کا قائل ہونا بلاضرورت ہے نیز اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض ارواح بے ہوش بھی نہ ہوں گی، چنانچہ " فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ" (پس آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں وہ بے ہوش ہوجائیں گے) کے بعد " اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ" (مگر جسے اللہ چاہے) مذکور ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت استثناء کا وقوف بھی ہوگا چنانچہ آپ فرماتے ہیں: " فَاِنّ النَّاسَ یَصْعَقُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَصْعَقَ مَعَهُمْ فَاَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ یُفِیْقُ فَاِذَا مُوْسٰی بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِیْ کَانَ فِیْمَنْ صَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِیْ اَوْ کَانَ مِمَّنِ اسْتَثْنَی اللّٰهُ مُتَّفِقٌ عَلَیْهِ"۔

یعنی قیامت میں سب لوگ بے ہوش ہوجائیں گے اور مجھے سب سے پہلے افاقہ ہوگا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو عرش کا پایہ پکڑے ہوئے دیکھوں گا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ بھی سب کے ساتھ بے ہوش ہوں گے پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آجائیں گے یا وہ بے ہوش ہی

نہ ہوں گے(کیونکہ وہ ایک بار طور پر بے ہوش ہو چکے ہیں اُس کے عوض آج صعقہ سے محفوظ رہے کما فی روایہ) اور اُن لوگوں میں داخل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ احتمال کے موسیٰ علیہ السلام کو ان لوگوں میں داخل فرمایا ہے جو صعق سے مستثنیٰ ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مشیت استثنا کا وقوع ہوگا ورنہ احتمال ثانی صحیح نہ ہوتا یہ تو ایک اشکال علمی تھا جس کو میں نے رفع کر دیا۔

تصرف وحکمت

اب اگلے اجزا آیت کی تفسیر کرتا ہوں۔ ''اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالق بھی اللہ تعالیٰ ہیں اور حاکم بھی وہی ہیں۔ یعنی پس ان کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے۔ کیونکہ ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے۔ اس پر یہ ابہام ہوتا ہے کہ ہر تصرف پر راضی ہونا جب ممکن ہے جب کہ ہر تصرف مفید اور گوارا اور موافق مصلحت ہو اور اگر کوئی تصرف مضر یا خلاف حکمت ہوا تو اس پر کون راضی ہوگا۔ ہر چند کہ اس شبہ کا ایک جواب۔ ''اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' (یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا۔ مگر جسے اللہ چاہے) میں بھی آ گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ غالب علی الحکمت ہیں مغلوب عن الحکمت نہیں وہ اپنے تصرفات و احکام میں حکمتوں کے تابع نہیں بلکہ حکمت ان کے تصرف کے تابع ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت کو سوچ کر تصرف کریں بلکہ وہ جو تصرف کرتے ہیں حکمت خود ادھر ہی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ جواب اذہان عامہ سے بالا ہے[1] اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔ اس لئے

(۱) عوام کے ذہنوں سے بلند تر ہے۔

آگے اس شبہ کا دوسرا جواب دیتے ہیں جو اذہانِ عامہ کے قریب ہے فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ خوبیوں کے بھرے ہیں ان کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی یا حکمت کے خلاف کیونکر ہوسکتا ہے۔ آگے اس کی دلیل مذکور ہے کہ وہ رب ہیں پالنے والے ہیں۔ یعنی ان کو تمہارے ساتھ پالنے کی محبت ہے۔ پھر یہ احتمال کیوں ہے کہ ان کا کوئی تصرف خلاف حکمت یا مضر ہوگا پھر یہاں "ربکم" کی جگہ "رب العٰلمین" فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسے پروردگار ہیں کہ انہوں نے تمہاری تربیت کی یہ صورت کی کہ محض تمہارے واسطے تمام عالم کی پرورش کرتے ہیں۔ بلاتشبیہ یہ شان ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا خرنداز برائے گلے خارہا (۱)

خدا تعالیٰ باروخار سے منزہ ہیں یہ شعر صرف اسی معنی کی تشبیہ وتوضیح کے لئے پڑھ دیا ہے کہ ایک انسان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے اور اتنا بڑا کارخانہ جاری کیا ہے، رہا یہ کہ اس مقدمہ کا (کہ سب عالم ہمارے واسطے پیدا کیا گیا ہے) یہاں کس لفظ میں ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن تو سارا ایک ہی کلام ہے اگر یہاں صراحۃً اس کا ذکر نہیں تو دوسری جگہ تو صراحۃً مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے: "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" کہ تمام چیزیں زمین کی اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی خاطر پیدا کی ہیں۔ "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ" کہ تمام چیزوں کو آسمان وزمین کو تمہارے لئے مسخر کردیا۔ تسخیر کے وہ معنی نہیں جو تسخیر حب کے اعمال میں سمجھے جاتے ہیں بلکہ یہاں معنی یہ ہیں کہ تمام عالم کو تمہاری خدمت اور تمہاری حاجات پورا کرنے میں لگا رکھا ہے۔ یہ

(۱) ایک دل کے واسطے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ایک پھول کے واسطے کانٹے اٹھاتے ہیں۔

مطلب نہیں کہ سب تمہارے حکم کے مطیع وتابعدار ہیں۔غرض سب چیزیں انسان کے واسطے پیدا کی گئی ہیں۔"رب العٰلمین" میں اسی طرف اشارہ ہے اب تو بلاغبار ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کا ہر تصرف حکمت کے موافق ہوگا۔

دعا وتفویض

پھراس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہر تصرف حق تعالیٰ کا حکمت کے موافق ہے تو اب تفویض کے ساتھ دعا کیونکر جمع ہوگی بس دعا کو چھوڑ دینا چاہئے، چنانچہ بعض صوفیہ کو جن پر تفویض غالب ہے۔ یہ شبہ ہوا ہے کہ تفویض و دعا جمع نہیں ہوسکتی۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں جمع نہ ہوسکتے تو یہاں تفویض و دعا کو جمع کیونکر کیا جاتا کہ اول تعلیم تفویض کی گئی پھر دعا کا امر(١) کیا گیا شاید کہو کہ یہاں ایک جزو ناسخ ہے ایک منسوخ ہے تو میں کہتا ہوں وہ ناسخ موخر ہوگا یا مقدم اگر ناسخ مقدم ہے تو خلاف قاعدہ ہے اور موخر ہے تو دعا مامور بہ رہی تفویض منسوخ ہوگئی اور یہ اجماع کے بھی خلاف ہے اور تمہارے مدعا کے بھی خلاف ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ ناسخ مقدم فی التلاوۃ ہے مگر یہ طالب علمانہ احتمال ہے اور لغو جواب ہے کیونکہ ناسخ کا مقدم ہونا خلاف قاعدہ ہے اس کے لئے کسی خاص دلیل کی ضرورت ہے بدوں دلیل کے ایسا احتمال مسموع(٢) نہیں ہوسکتا طلبا میں یہ مرض یعنی بات کی پچ کرنا معقول پڑھنے کی بدولت پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم نے منیۃ المصلی پڑھتے ہوئے جب یہ مسئلہ آیا کہ بال مردار کے بھی پاک ہیں بجز خنزیر کے۔ اور میں نے تبرعاً اس کی تسلی بیان کردی کہ بال میں حیات نہیں اس لئے اس میں موت کا اثر نہیں ہوا۔ اس لئے وہ نجس نہیں ہوا تو انہوں نے

(١) پہلے تفویض کی تعلیم دی گئی پھر دعا کا حکم دیا گیا (٢) قابل توجہ نہیں۔

اعتراض کیا کہ بال میں تو حیات ہے۔ میں نے کہا بال میں حیات نہیں اور یہ جو بعض دفعہ بال کھینچنے میں الم کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بال کھینچنے میں کھال بھی کھنچتی ہے اور کھال میں حیات ہے اگر بال قینچی سے اس طرح تراشے جائیں کہ کھال نہ کھنچے تو پھر الم نہ ہوگا تو وہ طالب علم کیا کہتا ہے کہ مجھے تو بال تراشنے میں بھی ایذا ہوتی ہے میں نے کہا اس کا کچھ جواب نہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں ایک حدیث میں یہ آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت تقسیم کرتے ہوئے ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر کیا تو ایک صاحب بولے کہ یہ تو نعوذ باللہ خلاف عدل ہے مولانا نے فرمایا پھر عدل کی کیا صورت تھی۔ کہنے لگا کہ اونٹ کے بدلہ میں ایک بکری ہوتی۔ مولانا نے فرمایا یہ کہیں دنیا میں بھی ہوا ہے کہ ایک اونٹ کے برابر ایک بکری ہو۔ کہنے لگا جی ہاں ہمارے ملک میں تو اونٹ بکری برابر ہوتے ہیں۔ بھلا اس بے ہودگی کی کوئی حد ہے بس ایسا ہی یہ احتمال ہے کہ شاید دعا کا حکم منسوخ ہو۔ غرض دعا اور تفویض جمع ہوسکتی ہے اور جن لوگوں کو اُن میں منافات کا شبہ ہوا ہے ان کو یا شبہ ہوا ہے یا وہ غلبہ حال میں ایسا کہتے ہیں۔ مثنوی میں مولانا نے ان دونوں جماعتوں کے اقوال نقل کئے ہیں ان کے بھی جو دعا و تفویض میں منافات سمجھ کر تارک دعا ہو گئے اور ان کے بھی جو دعا اور تفویض کو جمع کرتے ہیں چنانچہ ایک جماعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کفر باشد نزد شان کردن دعا ۔۔۔ کائے خدا از ما بگرداں ایں قضا

کہ ان کے نزدیک دعا کرنا کفر ہے یعنی خلاف تفویض ہے جو کفر طریقت ہے یہ تو مغلوب الحال ہیں اور جو غالب علی الاحوال ہیں وہ یوں کہتے ہیں ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو ۔۔۔ ایمنی از تو مہابت ہم زتو(۱)

(۱) ”دعا بھی تیری جانب سے اور قبولیت بھی تیری جانب سے، بے خوفی تیری جانب سے اور خوف بھی تیری جانب سے“۔

کہ دعا بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ہے قبول بھی اسی طرف سے ہے ہم خودنہیں دُعا کرتے آگے صاف کہتے ہیں ؎

چوں خدا از خود سوال و گدکند پس دُعائے خویشتن چوں رد کند

یعنی جب خدا تعالیٰ خود اپنے ہی سے دعا کریں تو پھر وہ دعا خلاف تفویض کیونکر ہوسکتی ہے خود دعا کرنے کا مطلب یہ ہے ان کی مرضی اور حکم سے دعا کی جاتی ہے اس کو عاشقانہ عنوان سے تعبیر کر دیا۔ یہی مضمون دوسری جگہ ہے ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچونے یک دہان پنہان است درلب ہائے دلے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہای وہوئی درفگندہ درسما

ماچو چنگیم و تو زخمہ می زنی زاری ازمانے تو زاری میکنی (۱)

غرض خدا کا اپنے سے مانگنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مانگنے کا حکم کیا ہے تو ہمارا مانگنا خدا کے حکم سے ہے اور جو کام حکم سے ہوتا ہے وہ گویا حاکم ہی کا فعل ہے اور اس سے آگے بڑھنا وحدۃ الوجود والوں کو مبارک ہو اگر وہ بے سمجھے بڑھتے ہیں تو گنہگار ہوتے ہیں اور جو سمجھ کر کچھ کہتے ہیں دوسرے تو غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے ہماری ہمت نہیں۔

مقصود دعا و تفویض

اور سب سے بڑی دلیل دعاء کے مشروع ہونے کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عادت شریفہ تھی دعا کرنے کی فعلاً بھی اور قولاً بھی اور حضور ﷺ سے زیادہ کوئی صاحب تفویض نہیں ہوسکتا اگر دعا تفویض کے خلاف ہوتی تو حضور ﷺ دعا کیوں

(۱) بانسری کی طرح میرے دو منہ ہیں جیسے اس کا ایک منہ ہونٹوں میں چھپا ہے دوسرے منہ سے فریاد نکل رہی ہے جس سے اس نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے، میں تجھ سے راحت و آرام چاہتا ہوں تو مجھے زخم دیتا ہے۔ میں مال دولت چاہتا ہوں تو غم میں مبتلا کرتا ہے۔

کرتے ۔معلوم ہوا کہ منافی نہیں، حضور ﷺ نے دعا کا یہاں تک اہتمام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں ہر حاجت حق تعالیٰ سے مانگوحتی کہ نمک نہ ہے

تو نمک بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو تسمہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ اس طرح حضور ﷺ نے ہم کو ادب بتلایا ہے کہ جو بعضوں کی عادت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑی ہی چیز مانگتے ہیں اور چھوٹی چیز نہیں مانگتے۔ گویا ان کے نزدیک یہ بڑی چیز تو خدا تعالیٰ سے مانگنے کے قابل ہے اور چھوٹی اس قابل نہیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں بھی کوئی چیز گراں اور بڑی ہے اور کوئی معمولی اور یہ سمجھنا عظمت حق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک لاکھ روپے اور نمک کی کنکری برابر ہے ہفت اقلیم کی سلطنت اور جوتی کا تسمہ برابر ہے اگر تم اس کو عظیم سمجھتے ہو تو تم خدا کی عظمت سے خالی ہو۔ سبحان اللہ حضور ﷺ کی تعلیم بھی کیسی عجیب تعلیم ہے کہ ادھر تو دعا کا اس قدر اہتمام اور اس کے باریک باریک آداب کی تعلیم فرمائی۔ ادھر تفویض کی بھی تعلیم ہے اور اس کے حقوق بتلائے گئے ہیں معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ محقق کو اسی واسطے جامع بین الضدین کہتے ہیں کہ جو باتیں ظاہر میں اضداد معلوم ہوتی ہیں وہ ان کو سہولت سے جمع کر دیتا ہے ۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناک نداند جام وسندان باختن

ایک ہاتھ میں شریعت کا جام اور دوسرے میں عشق کا جام، ہر ہولناک ان دونوں کے ساتھ بیک وقت نمٹنا نہیں چاہتا۔

غرض آگے اس شبہ کو دفع کیا جاتا ہے کہ تفویض سے ترک دعا لازم نہیں آتا بلکہ ہم حکم دیتے ہیں کہ تفویض کے ساتھ دعا بھی کرو۔ اُدْعُوْ رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ

خُــــفیَۃً اپنے پروردگار سے الحاح کے ساتھ دعا کرو ذلت ظاہر ہوئے بھی اور آہستہ آہستہ بھی میرے نزدیک تـضـرع وخفیہ (پکارا کرو چپکے چپکے) دونوں کے مجموعہ سے الحاح واظہار عبدیت مقصود ہے۔ کیونکہ الحاح۔ اظہا بندگی کے وقت لہجہ ایک نہیں رہتا کبھی آواز بلند ہوتی ہے کبھی آہستہ ہوتی ہے اس لئے دو لفظ لائے گئے جس سے اس پر تنبیہ کردی گئی کہ ایک لہجہ اور ایک وضع کے پابند نہ ہو کیونکہ تقیید سے عبدیت وخشوع فوت ہوجاتا ہے اس میں تنبیہ کردی گئی کہ دعا تفویض کے منافی نہیں۔ کیونکہ تفویض کا منشا بھی عبدیت ہے اور دعا کا منشاء بھی عبدیت ہے بلکہ دعا میں شکستگی اور عجز و نیاز زیادہ ظاہر ہوتا ہے جو عین مقتضائے عبدیت ہے پھر یہ تفویض کے خلاف کیونکر ہو۔ تفویض کے خلاف تو وہ دعا ہے جس سے مقصود یہ ہو کہ جو ہم نے تجویز کرلیا ہے جو ہم مانگ رہے ہیں وہی ہوجائے تو راضی ہیں ورنہ ناراض ہیں اور جس دعا سے محض اظہار عبدیت مقصود ہو اور دعا کرنے والا دل سے ہر شق پر راضی ہو، کہ خواہ دعا منظور ہو یا نہ ہو یعنی جو مانگا جارہا ہے وہ عطاء ہو یا نہ ہو میں ہر صورت پر راضی ہوں تو یہ دعا تفویض کے خلاف کیونکر ہوسکتی ہے پس تضرعا وخفیہ (پکارا کرو چپکے چپکے) کے بڑھانے سے متنبہ کردیا گیا کہ دعا اظہار عجز وعبدیت کے لئے ہونی چاہئے اور خفیہ کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تضرع سے مراد اعلان ہے مگر بعض دفعہ اعلان میں بے ادبی کا لہجہ ہوجاتا ہے اسی لئے رفع صورت عندالنبی کی ممانعت ہے تو اعلان کو تضرع سے تعبیر کرکے بتلادیا گیا ہے کہ دعا اعلاناً ہو تو تذلل کے ساتھ ہو۔

خلاف تفویض دُعا

آگے ارشاد ہے: اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں

کو ناپسند کرتا ہے) اس میں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ دعا کے لئے حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا چاہئے مثلاً دعا میں استعجال نہ کرے(۱)۔ عدم ظہور اثر سے گھبرائے نہیں اور حرام چیزوں کی دعا نہ کرے اور مستحیل عادی وعقلی کی دعا نہ کرے(۲) جیسا یوں کہنے لگے کہ اے اللہ مجھے نبی کر دے وغیرہ وغیرہ کیونکہ نبوت مانگنے سے نہیں ملا کرتی، افسوس نبوت ایسی تو چیز مانگے سے بھی نہیں ملتی اور بعض لوگ آج کل اس کے مدعی ہیں کہ ان کو بے مانگ اور بے دیئے ہی نبوت مل گئی ہے۔ بس میں تو ان کے بارے میں یہ کہتا ہوں ؎

وقوم یدعون وصال لیلیٰ
ولیلیٰ لا تقولهم بذاكا۔ انه لا يحب المعتدين (۳)

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تفویض کے خلاف وہ دعا ہے جو حدود سے متجاوز ہو اور جو دعا حدود شرعیہ کے اندر ہو تو چونکہ وہ حدود اسی ذات کے مقرر کردہ ہیں جس نے تفویض کا امر کیا اور تفویض کے حدود مقرر کئے ہیں، اس لئے ان حدود مقررہ کے اندر جو دعا ہوگی وہ تفویض کے خلاف کسی طرح نہ ہوگی۔

تصرف بلا واسطہ

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب تفویض کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے تو پھر گناہ پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تصرف حق ہی ہے اس شبہ کو رفع کرتے ہیں کہ خبردار گناہ مت کرنا وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کہ زمین میں فساد نہ کرنا بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے۔

(۱) جلدی نہ مچائے (۲) عادۃً اور عقلاً جو کام محال ہو اس کی دعا نہ کرے (۳) اور ایک قوم وہ جو وصال لیلیٰ چاہتی ہے اور اس وصال کو ان کے قریب بھی نہیں ہونے دیتی۔

مطلب یہ گناہ موجب فساد ہے اور ہم نے فساد کو نبوت اور تشریع احکام کے ذریعہ سے ممنوع قرار دیا ہے پس اب تم اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور گو گناہ بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ خالق خیر وشر وہی ہے مگر یہ تصرف بلاواسطہ حق تعالیٰ کا تصرف نہیں، بلکہ اس کے اندر تم واسطہ ہو کیونکہ بندہ کاسب افعال ہے[1] اور واسطہ مذموم ہے۔ اور گناہ میں بندہ کے واسطہ ہونے پر لَا تُفْسِدُوْا میں خطاب کے صیغہ سے بھی دلالت ہورہی ہے خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ ہو اُس پر راضی رہو، اور جو تصرف ایسا ہو جس میں تمہارے فعل قبیح کا واسطہ ہو اُس پر راضی ہونا بایں معنی کہ گناہوں پر جرأت کرنے لگو اور اُن سے بچنے کا اہتمام نہ کرو۔ تفویض نہیں۔

امن عامہ

اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کے معنی یہ ہیں اور امر ونواہی کے نزول اور نبی کے مبعوث ہونے سے زمین کی اصلاح کردی گئی اس میں ایک بڑے مسئلہ کا فیصلہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ اوامر شرعیہ پر عمل کرنا اور نواہی شرع سے بچنا جڑ ہے امن کی اور یہی رافع ہے فساد کا اور آج کل یہ مسئلہ ہندوستان میں مختلف فیہ ہورہا ہے کہ امن کی کیا صورت ہونا چاہئے کوئی کہتا ہے کہ امن کی صورت یہ ہے کہ رافضی کچھ مسائل سنیوں کے، اور سنی کچھ مسائل رافضیوں کے مان لیں۔ بدعتی کچھ باتیں اہلِ حق کی لے لیں۔ اہلِ حق کچھ باتیں بدعتیوں کی مان لیں کوئی کہتا ہے کہ گائے کی قربانی بند کردو۔ اس سے امن ہوجائے گا مگر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اوامر الٰہیہ کی پابندی کرو نواہی سے بچتے رہو۔ بس یہی صورت اصلاح ہے زمین میں امن اسی سے قائم ہوسکتا ہے۔ اس کے خلاف جو صورت ہے وہ فساد کی

(۱) افعال کا کسب کرنے والا ہے۔

صورت ہے مگر افسوس لوگ خدا کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے نئی صورتیں امن کی گھڑتے ہیں۔

منشاء تفویض

اب یہ شبہ بھی رفع ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ گناہ پر راضی ہونا تفویض نہیں۔ اب گناہ سے منع کرنے کے بعد طاعات کا امر فرماتے ہیں: وادعوہ خوفا وطمعا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ خوف و رجاء کے ساتھ یعنی عبادت کر کے نہ تو ناز ہو نہ مایوس ہو۔ ناز تو جب ہوتا ہے کہ اپنی عبادت کو کامل سمجھے اور مایوسی جب ہوتی ہے کہ اپنی عبادت کو بالکل ہی بے کار سمجھے۔ حاصل تعلیم کا یہ ہوا کہ نہ تو عبادت کو ایسا کامل سمجھو کہ ناز کرنے لگو نہ ایسا ناقص سمجھو کہ بیکار سمجھنے لگو اس میں بتلا دیا گیا کہ تفویض کا مقتضی یہ ہے کہ عبادت میں لگو اور گناہوں سے بچو کیونکہ تفویض کا منشاء ادائے حق الوہیت ہے اور اظہار عبدیت۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اس کا مقتضا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا کی نافرمانی کرو یا یہ ہوسکتا ہے کہ اُس کی عبادت میں مشغول ہو یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ عبدیت کا مقتضا اطاعت ہے نا کہ معصیت، آگے اطاعت کی مزید ترغیب ہے۔ ان رحمة اللّٰه قريب من المحسنين کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بلاشبہ نیک کاروں سے قریب ہے۔ پس تم کو احسان کی کوشش کرنا چاہئے تا کہ رحمت تم سے قریب ہو۔

شرط احسان

یہاں سے میں بعض لوگوں کی غلطی پر متنبہ کرتا ہوں۔ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ احسان یعنی اخلاص یہ ہے کہ عبادت، خوف و رجا کے ساتھ نہ ہو بلکہ محض رضا کے لئے ہو اس کے بعد یہ لوگ ڈینگے ہانکتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہ

ہے دوزخ کی کیا پرواہ ہے یہ سخت بے ادبی ہے اور ان کا یہ دعویٰ خود اس آیت سے رد ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خوف وطمع کے ساتھ عبادت کا حکم فرمایا ہے اور اس پر احسان کو متفرع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احسان یہی ہے کہ عبادت خوف وطمع کے ساتھ ہو۔ خوف وطمع احسان کے منافی نہیں۔ بس اخلاص کے لئے شرط یہ ہے کہ عمل میں دنیا کی کوئی غرض نہ ہو۔ یہ شرط نہیں کہ خوف وطمع اخروی بھی نہ ہو جب اصل دعویٰ ہی غلط ہے تو اس پر جو باتیں متفرع ہیں کہ جنت سے لاپروائی اور دوزخ سے عدم مبالات ظاہر کی جاتی ہے ان کا گستاخی ہونا ظاہر ہے مگر یہ سب باتیں میں غالین کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ غالین یعنی حالیین کے بارے میں نہیں کہہ رہا جو مغلوب الحال ہیں وہ حضرات مستثنیٰ ہیں اگر جنت سے لاپروائی یا دوزخ سے عدم مبالات ان کے کلام میں نظر سے گزرے تو اُن پر اعتراض نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ حضرات باطن میں سب سے بڑھ کر باادب ہیں گو ظاہر میں بے ادب معلوم ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں اہل سکر کے بارے میں جن کی زبان سے خلاف ادب باتیں نکل جاتی ہیں کہ ؎

بے ادب تر نیست زوکس در جہاں ‏ ‏ ‏ ‏ با ادب تر نیست زوکس درنہاں (۱)

اور اہل صحو کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں جو باوجود صحو کے ایسی بے تمیزی کی باتیں بناتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب ‏ ‏ ‏ ‏ بے ادب محروم ماند از فضل رب

بے ادب تنہا نہ خود را درشت بد ‏ ‏ ‏ ‏ بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد (۲)

(۱) ''اس سے زیادہ بے ادب دنیا میں کوئی نہیں۔ اندرونی طور پر اس سے زیادہ باادب کوئی نہیں'' (۲) ''ہم خدا سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں، بے ادب محروم رہتا ہے خدا کے فضل سے۔ بے ادب خود اپنی آگ میں نہیں جلتا۔ بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دیتا ہے۔

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق باشد او درجہ حیرت غریق
از ادب پر نور گشت ست ایں فلک واز ادب معصوم و پاک آمد ملک
بدز گستاخی کسوف آفتاب شد عزازیلے زجر آت ردباب(۱)

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشمان دوختند از سخن با عالمے را سوختند (۲)

بھلا جو شخص ایک ادنیٰ مخلوق سے بھی صبر نہ کرے۔ بیوی بچوں سے بھی صبر نہ کر سکے اس کا کیا منہ ہے جو جنت سے لاپروائی ظاہر کرے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایک صبرت نیست از فرزند وزن صبر چوں داری زرب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری زنعم الماجدون (۳)

بحمد اللہ اب سب شبہات مرتفع ہوئے جس کے بعد مضمون'' اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ''یعنی مضمون تو فیض مکمل ہو گیا۔

حاصلِ مضمون

خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ'' اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ''میں تفویض کا امر ہے اس پر شبہ ہوا کہ جب تصرف مضر، خلاف حکمت ہو تو اس پر کیونکر راضی رہیں۔ ''فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ''(کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ

(۱) جو شخص راستہ میں گستاخی کرتا ہے وہ گہرے دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔ ادب سے دنیا روشن ہے اور ادب کی وجہ سے فرشتہ بے گناہ اور پاک ہیں۔ سورج کا گہن ہونا گستاخی کا بدلہ ہے، شیطان بے ادبی کی وجہ سے پھٹکارہ گیا (۲)''اے وہ قوم ظالم ہے جو آنکھیں بند رکھ کر باتوں سے دنیا کو جلاتی ہے'' (۳)''اے وہ شخص تو صبر نہیں کر سکتا اپنے متعلقین سے اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے۔ اے شخص تجھ کو کمینی دنیا سے صبر کی طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے''

کر ہے) سے اس کو دفع کیا گیا پھر شبہ ہوا کہ تفویض کے ساتھ دعا نہ کرنا چاہئے۔ دعا اس کے خلاف ہے۔ "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" (تم اپنے پروردگار کو پکارا کرو اور چپکے چپکے پکارو اور بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا) میں اس کو دفع کیا گیا اور بتلا دیا کہ دعا عین مقتضائے عبدیت[1] ہے اور تفویض کے خلاف وہ دعا ہے جو حدود سے متجاوز ہو اس کے بعد شبہ ہوا کہ پھر گناہ بھی ایک تصرف ہے اس پر بھی تفویض کر کے راضی رہنا چاہئے وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اور تم زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ) میں اس کو رفع کیا گیا[2] اور بتلا دیا گیا کہ یہ خدا کا تصرف بلاواسطہ نہیں۔ بلکہ تم اس کے اندر واسطہ ہو۔ پھر طاعت کی ترغیب دی اور اُس پر ترتیب رحمت کی بشارت دی[3]۔ حاصل یہ ہوا کہ جو تصرفات اللہ تعالیٰ کے ایسے ہیں جن میں تمہارے اختیار وارادہ کو دخل نہیں اُن میں تفویض وفنائے تجویز ورضا سے کام لو[4]۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا ہو۔[5]

وصلی اللّٰہ علی سیّدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہ واصحابہ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

---

(۱) دعا کرنا عبدیت کا مقتضا ہے۔ (۲) یہ شبہ دور کیا گیا (۳) رحمت متوجہ ہونے کی خوشخبری سنائی (۴) ان معاملات میں اپنی تجاویز کو فنا کرو اور تفویض اختیار کر کے جو واقع ہو اس پر راضی رہو (۵) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کے حق میں یہ دعا قبول فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۴ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ